بسم اللہ الرحمن الرحیم

عیون العرفان
فی
علوم القرآن

مولانا قاضی مظہر الدین احمد بلگرامی
استاد شعبۂ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مجلس نشریات اسلام
۱۔کے۔۳، ناظم آباد مینشن، ناظم آباد، کراچی ۱۸

عیون العرفان

فی

علوم القرآن

قاضی مظہر الدین احمد بلگرامی
استاد شعبہ دینیات
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ناشر
مجلس نشریاتِ اسلام ۱/کے-۳ ناظم آباد مینشن نزد برقخانہ - ناظم آباد ۱ کراچی ۱۸

نام کتاب ــــــــــــ عیون العرفان فی علوم القرآن
تالیف ــــــــــــ قاضی مظہر الدین احمد بلگرامی
کتابت ــــــــــــ سلطان احمد بجنوری
طباعت ــــــــــــ شکیل پرنٹنگ پریس کراچی
تعداد ــــــــــــ ایک ہزار
قیمت ــــــــــــ ۳۸/= روپے

ناشر:
فضل ربّی ندوی

مجلسِ نشریاتِ اسلام
۱۔ کے۔ ۳ ناظم آباد مینشن ناظم آباد نمبر ۱ کراچی ۱۸

تقریظ از حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی مدظلہٗ

مولانا قاضی مظہرالدین احمد صاحب بلگرامی فاضل ازہر (مصر) اور فاضل مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور بھی ہیں، عرصۂ دراز سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ دینیات میں ذمہ دارانہ خدمات انجام دے رہے ہیں، اور اب کئی سال سے اس شعبہ کے مستقل صدر ہیں۔ موصوف ایک راسخ العقیدہ عالم دین ہیں، دیگر بہت سی خصوصیات کے علاوہ موصوف کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ تمام خارجی اور غیر متعلق مشغولیتوں سے یکسو ہوکر فرائض منصبی کی انجام دہی میں لگے رہتے ہیں، اور فاضل وقت تحقیق ومطالعہ اور تصنیف وتالیف کے کام میں صرف کرتے ہیں۔ زیر نظر تالیف سے قبل بھی ان کی بعض مفید کتب شائع ہو چکی ہیں۔

جمع و ترتیب قرآن، اسباب نزول آیات اور قرآن پاک کے محکم و متشابہ وغیرہ عنوانات پر عربی میں متعدد کتب اور رسائل ہیں اور عام کتب تفسیر میں بھی ان علوم قرآنی پر تفصیلی بحثیں موجود ہیں، لیکن اردو میں اس موضوع پر مستقل کتابیں بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ فاضل مؤلف نے کمر ہمت باندھ کر اس میدان میں قدم

رکھا اور تحقیق کا حق ادا کرنے کی سعی کی۔

"عیون العرفان فی علوم القرآن" اپنے رنگ کی پہلی تالیف ہے جس میں (علوم قرآن) کے ان ابواب سے متعلق تمام اہم اور ضروری مباحث کو محنت اور سلیقے سے سہل اسلوب میں یکجا کرنے کی سعی بلیغ کی گئی ہے۔ قلّتِ فرصت اور کثرت مشاغل کی وجہ سے اگرچہ پورے مسوّدہ پر نظر ڈالنے کا موقع نہیں ملا، لیکن جتنا کچھ بھی دیکھ سکا اس کی روشنی میں بے تکلّف کہا جا سکتا ہے کہ جناب مؤلّف نے بڑے شوق اور جذبے سے یہ خدمت انجام دی ہے اور مذکورہ بالا اہم عنوانات پر سیر حاصل کلام کیا ہے۔ بنیادی طور پر کتاب کے تین موضوع ہیں۔

(۱) جمع و ترتیبِ قرآن (پہلا باب)

(۲) شانِ نزول یا اسباب نزول (دوسرا باب)

(۳) محکم و متشابہ (تیسرا باب)

جمع و ترتیب قرآن کے تحت بیالیس ۴۲ ذیلی عنوان ہیں جن میں جمع و ترتیب اور حفاظت قرآن سے متعلق ایک ایک چیز کی تفصیل دی گئی ہے جس کو پڑھ کر جمع و ترتیب قرآن کی تاریخ کا نکھرا ہوا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ اسباب نزول یا شان نزول کی بحثیں اگرچہ نسبتاً مختصر ہیں اور پندرہ ذیلی عنوانات پر مشتمل ہیں، لیکن جامعیت اور انداز بیان کے لحاظ سے لائق مطالعہ ہیں۔ اس باب میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیقات اور نقاط نظر کو خاص طور پر سامنے رکھا گیا ہے۔ محکم و متشابہ کے عنوان کے نیچے انیس ۱۹ ذیلی عنوانات ہیں، جن پر سرسری نگاہ ڈالنے ہی سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ مولف نے محکم و متشابہ سے متعلق تمام اہم مباحث

پر محققانہ کلام کیا ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، امام راغب اصفہانیؒ اور امام رازیؒ وغیرہ جیسے بڑے بڑے محققین کے مسالک کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے، موضوع کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ اس کے مختلف گوشوں پر زیادہ تفصیل سے بحث کی جاتی، پھر بھی جتنا کچھ لکھا ہے اس کو پڑھ کر اس الجھے ہوئے مسئلہ کے بہت سے پہلو واضح ہو جاتے ہیں۔

توقع کی جاتی ہے کہ فاضل مولف کی اس محنت سے علماء، طلبہ اور عام اصحاب ذوق سبھی فائدہ اٹھائیں گے۔

(مفتی) عتیق الرحمن عثمانی (ندوۃ المصنفین)

۱۰ر نومبر ۱۹۷۸ء، مطابق ۸ر ذی الحجہ ۱۳۹۸ھ

تقریظ از پروفیسر سعید احمد صاحب اکبرآبادی
سابق ڈین فیکلٹی دینیات علی گڑھ
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مولانا قاضی مظہر الدین احمد صاحب بلگرامی جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی فیکلٹی آف تھیالوجی (سُنّی اور شیعہ دونوں شعبوں) میں سب سے زیادہ سینیر استاذ اور صدر شعبۂ سُنّی دینیات ہیں۔ پہلے بھی دو کتابیں شائع کر چکے ہیں جو مقبول عوام و خواص ہوئیں۔ ان کی یہ تیسری کتاب دونوں پر سبقت لے گئی ہے۔ یہ کتاب قرآن مجید سے متعلق تین اہم مباحث پر مشتمل ہے۔

(۱) قرآن مجید کا جمع و تدوین

(۲) اسباب نزول اور

(۳) محکم و متشابہ

میں نے اس کتاب کا مسودہ از اوّل تا آخر توجہ اور غور سے پڑھا ہے اس بنا پر مجھے یہ کہنے میں مسرت ہے کہ اگرچہ اردو میں مبحث اوّل پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن مبحث دوم و سوم پر اردو میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اصلاً اور بالذات نہیں لکھا گیا۔ البتہ عربی میں علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی الاتقان جو قرآن سے متعلق مباحث پر انسائیکلوپیڈیا کا حکم رکھتی ہے اُس

کے علاوہ اور بھی قدیم اور جدید کتابیں کثرت سے ہیں جن میں یہ مباحث پھیلے ہوئے ہیں۔ فاضل مولف لائق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے ان تمام کتابوں کو جن کا تذکرہ ماخذ کی فہرست میں ہے کمال توجہ اور حزم واحتیاط سے پڑھا اور پھر ان سب پھولوں کا ایک گلدستہ بنا کر ارباب نظر کے لئے پیش کردیا۔ اس کتاب میں تجزیہ و تحلیل اور تنقید کے بعد جو بیان اقرب الی الصواب نظر آیا اسے لے لیا اور اختلافات کو نظر انداز کردیا گیا ہے تاکہ قاری کے ذہن میں تشویش نہ پیدا ہو۔ جو کچھ لکھا ہے تحقیق اور غور و فکر کے بعد مستند حوالوں سے لکھا ہے۔ عبارت سہل وسلیس اور ماقل ودل کا مصداق اور حشو وزوائد سے پاک ہے باایں ہمہ جامعیت کا یہ عالم ہے کہ بحث کا کوئی گوشہ چھوٹنے نہیں پایا ہے ایہ کتاب عوام و خواص دونوں کے مطالعہ کے لائق ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حسن قبول عطا فرمائے۔ آمین

(پروفیسر) سعید احمد اکبر آبادی

۸ر نومبر ۱۹۷۸ء

فہرست مضامین

باب اول جمع و ترتیب قرآن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

علوم القرآن پر اب تک جس قدر اور جو کچھ بھی لکھا گیا ہے اس کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ بیش قیمت سرمایہ زیادہ تر عربی زبان میں ہے، جس سے صرف عربی داں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اردو زبان میں علوم القرآن پر جو کام ہوا ہے وہ بہت کم ہے۔ علامہ جلال الدین عبدالرحمٰن السیوطی المتوفی ۹۱۱ھ کی مشہور کتاب "الاتقان فی علوم القرآن" کا جو اردو ترجمہ مولانا محمد حلیم انصاری نے کیا ہے اور جس پر مولانا محمد عبدالحلیم چشتی کا مفید اور پُر مغز مقدمہ بھی علوم القرآن پر ہے، وہ اگرچہ ایک علمی خدمت ہے اور اس سے اردو داں طبقہ بھی کچھ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ لیکن اہلِ علم بخوبی جانتے ہیں کہ اس ترجمہ سے پورے طور پر علوم القرآن کے مباحث کی وضاحت نہیں ہو سکی ہے اس لئے کہ علامہ سیوطیؒ نے کہ جو نہ صرف علوم القرآن بلکہ متعدد علوم و فنون کے بحر ناپیدا کنار تھے سینکڑوں کتابوں کے مطالعہ کے بعد اپنی کتاب "الاتقان فی علوم القرآن" چار سال کی مدت میں پایۂ تکمیل کو پہنچائی جس میں انھوں نے بڑی تعداد میں علماء اور ماہرین فن کے اقوال نقل کر دیئے ہیں جس کے پڑھنے کے بعد اکثر مواقع میں کہی ہوئی بات کا صاف اور واضح طور پر مطلب سمجھنا دشوار ہوتا ہے اور پڑھنے والا پورے طور

پر مستفید نہیں ہو پاتا۔[1]

سیوطی رہ نے بعض انواع پر مفصّل بحث بھی کی ہے، لیکن ان کو بھی علوم القرآن پر بصیرت رکھنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ دینی کتب کے مطالعہ کا ذوق رکھنے والے اردو داں حضرات بلکہ مدارس دینیہ کے فارغ التحصیل اوسط درجہ کی استعداد رکھنے والے علمار و طلبہ کے لئے بھی ان کا سمجھنا آسان نہیں۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے علوم القرآن سے واقفیت ضروری ہے میری مراد تفاسیر قرآن نہیں بلکہ متن قرآن ہے کہ جس کے سمجھنے اور سمجھانے کی ابتدا بارھویں صدی ہجری کے مُصلح و مفکّر شاہ ولی اللہ دہلوی رح کے والد بزرگوار حضرت شاہ عبدالرحیم رح نے کی اور ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رح نے بھی متن قرآن سمجھنے اور سمجھانے پر زور دیا۔ انھوں نے علوم القرآن پر "الفوز الکبیر فی اصول التّفسیر" جیسی کتاب لکھ کر قرآن فہمی کے اصول بہت اچھے انداز میں سمجھائے اور تفاسیر کو ثانوی درجہ پر رکھا حالاں کہ شاہ ولی اللہ اور ان کے والد کا متن قرآن پڑھنے اور پڑھانے پر اس قدر زور دینا اُن کے زمانہ کے علمار کی روش کے بالکل خلاف تھا کیونکہ وہ لوگ پوری توجہ اپنے اپنے علمی ذوق کے مطابق کتب تفسیر کے پڑھانے میں صرف

---

[1] علوم القرآن پر مولانا حمید الدین فراہی رح کی بعض کتب کے اردو میں جو ترجمے ہوئے یا علوم القرآن کی بعض انواع پر علمار نے وقتاً فوقتاً اردو میں جو مضامین لکھے ہیں وہ ناکافی ہیں۔

کرتے تھے۔[1]

قرآن مجید کے متعلق یہ خیال قطعاً درست نہیں کہ وہ محض احکام و قوانین کا مجموعہ ہے، جن کے سمجھنے کے لئے نہ عقل و ذہن پر زیادہ زور ڈالنے کی ضرورت ہے اور نہ علوم القرآن سے واقفیت کی۔ اس میں شک نہیں کہ عام تعلیم کے اعتبار سے قرآن ایک آسان کتاب ہے اور ہر پڑھنے والا اپنی عقل و سمجھ کے مطابق اس سے فیض حاصل کرسکتا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہر کس و ناکس یوں ہی اس کو سمجھ سکتا ہے۔ بلکہ اس کو سمجھنے اور تہ تک پہنچنے کے لیے کچھ اصول و علوم ہیں کہ جن کو جانے بغیر وہ پورے طور پر سمجھ میں نہیں آسکتا۔ قرآن مجید جو کچھ بتاتا ہے وہ فطرت انسانی کے مطابق اور مناسب ہونے کی وجہ سے جلد سمجھ میں آجاتا، دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھولا ہوا سبق یاد دلایا جارہا ہے۔ غور و فکر سے کام لے کر جو شخص حق کی تلاش چاہے گا اس کو اپنا مقصد حاصل کرنے میں ضرور کامیابی ہوگی اور قرآن مجید کے آسان ہونے کا یہی مطلب ہے۔

---

[1] "اس سے پہلے علماء کا یہ دستور تھا کہ قرآن شریف فقط تلاوت کے لئے پڑھاتے اور مطالب سکھانے کے لئے جس فن سے انھیں دلچسپی ہوتی، اس قسم کی ایک تفسیر طالب علم کو پڑھا دیتے، جس سے قرآن شریف گویا اس فن کی ایک اعلیٰ کتاب بن جاتی اور جو اخلاقی ذہنیت استاذ کی طبیعت میں مرکوز ہوتی، تفسیر پڑھنے سے (طالب کے ذہن میں) اور راسخ ہوجاتی"

(الفرقان شاہ ولی نمبر مقالہ مولانا عبید اللہ سندھی) سنہ ۱۹۴۱ء

علوم القرآن کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کی بعض انواع مثلاً "علم التفسیر" اور "علم اسباب النزول" وغیرہ کا ظہور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے عہد میں ہو چکا تھا۔ پہلی صدی ہجری سے اب تک ہر صدی میں علوم القرآن پر برابر کام ہوتا رہا ہے جس کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے۔

ایک عرصہ سے خیال تھا کہ "علوم القرآن" کی بعض انواع پر اس ڈھنگ سے اردو میں کچھ لکھا جائے کہ جو عام فہم ہو، جس سے ارباب فن کے علاوہ مدارس دینیہ کے طلبہ بلکہ وہ لوگ بھی کچھ استفادہ کر سکیں کہ جو علوم دینیہ کے مطالعہ کا شوق و ذوق رکھتے ہیں۔

اپنے اس دیرینہ ارادہ کو پورا کرنے کے لئے میں نے علوم القرآن کی تین انواع سے اس کی ابتدا کی ہے جس کا نام میں نے "عیون العرفان فی علوم القرآن" رکھا ہے۔ اور ان تین موضوعات میں حسب ذیل انواع پیش کی گئی ہیں۔

پہلا موضوع "جمع و ترتیب قرآن" پر" دوسرا " اسباب النزول" پر اور تیسرے موضوع میں "محکم و متشابہ" کو بیان کیا گیا ہے۔

پہلا موضوع کسی قدر طویل ہو گیا ہے اور اس کو اگر جمع قرآن کی مختصر تاریخ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ اس موضوع میں قرآن کریم سے متعلق بعض اہم مباحث آ گئے ہیں، جن کو قرآن کی تاریخ لکھنے والے اکثر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ بقیہ دو موضوع طویل نہیں ہیں۔ اختصار کے خیال سے ان میں ضروری مباحث کے بیان کو کافی سمجھا گیا۔ اگرچہ ابھی ان میں مزید اضافہ کی گنجائش ہے۔

ان موضوعات میں چھہتر (۷۶) ذیلی عنوانات ہیں جن کے لکھنے میں چالیس سے زائد چھوٹی بڑی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے، جن کے نام ماخذ و مراجع میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

ان موضوعات کے پیش کرنے سے میری غرض اہلِ علم کو اس اہم کام کی طرف متوجہ کرنا ہے، مجھے قوی امید ہے کہ اس کام کو علوم القرآن سے دلچسپی رکھنے والے زیادہ بہتر طریقے سے کر سکیں گے" وفوق کلّ ذی علمٍ علیم"

ان کو عام فہم بنانے کے لئے جہاں تک ہو سکا مشکل الفاظ کے استعمال سے بچنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ پڑھنے والے سمجھ سکیں کہ کیا بتایا جا رہا ہے، لیکن جہاں اصطلاحی الفاظ استعمال کیے بغیر بات کا سمجھنا ناممکن نہ تھا وہاں بدرجۂ مجبوری ان ہی سے مفہوم ادا کیا گیا ہے۔

اس کوشش میں مجھے کہاں تک کامیابی ہوئی ہے اس کا صحیح فیصلہ تو پڑھنے والے ہی کریں گے لیکن میں اپنی کوتاہیوں کا اعتراف اصحابِ علم اور اربابِ بصیرت کے فیصلے سے پہلے ہی کرتا ہوں کہ ان موضوعات میں سے کسی موضوع کا حق بھی پورے طور پر ادا نہیں ہو سکا ہے، اس لئے کہ ہر موضوع ایک مستقل تالیف کا متقاضی ہے۔

بڑی ناسپاسی ہو گی اگر میں اپنے شعبہ کے رفقاء کار اور خاص طور سے ڈاکٹر عبدالعلیم خاں صاحب کا شکریہ ادا نہ کروں کہ جن کے قیمتی مشوروں نے اس کتاب کی افادیت میں اضافہ کیا۔

یہ تعارف میں اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری اس

سعی کو مشکور فرمائے۔ علوم القرآن پر مزید کچھ لکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس کو شرفِ قبولیت بخشے۔ آمین

(پروفیسر) قاضی مظہر الدین احمد بلگرامی مظاہری
سابق صدر شعبہ سُنّی دینیات و ڈین فیکلٹی دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ ۳۰؍جون ۱۹۷۸ء

فاضل جامع ازھر قاہرہ (مصر)

باب اوّل

جمع و ترتیب قرآن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لفظ قرآن کے معنی

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ، وَعَلٰی کُلِّ مَنِ اتَّبَعَھُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ۔

قرآن مصدر ہے جو قرء سے بنا ہے اور اس کے معنی ہیں پڑھنا جیسے کہ لفظ قراءۃ "قرء" کا مصدر ہے جس کے معنی پڑھنے کے ہیں۔

قرآن مجید میں ہے۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۞ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۞ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ

سورۃ القیامہ پ ۲۹ آیت ۱۶ تا ۱۸

(جب وحی نازل ہوا کرے تو آپؐ اس کے ختم ہونے سے پہلے) قرآن پر اپنی زبان نہ ہلایا کیجیے، اس خیال سے کہ آپؐ اس کو جلدی جلدی لیں، بیشک ہمارے ذمہ ہے اس کا (آپؐ کے قلب میں) جمع کر دینا اور اس کو (آپؐ کا) پڑھنا تو جب ہم پڑھا کریں (یعنی ہمارا فرشتہ پڑھا کرے) تو آپؐ (بھی) اسی طرح سے پڑھا کیجیے۔

اور شریعت میں قرآن اس کتاب کو کہا جاتا ہے کہ جو خاص الفاظ میں خاص ترتیب کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جبریل امینؑ کے ذریعہ

نازل کی گئی، اور بالکل اسی طرح سے اب تک محفوظ ہے جس کو نماز میں اور خارج نماز عبادت کے طور پر پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس صورت میں مصدر مفعول کے معنی میں ہے اور قرآن ایک پڑھی جانے والی خاص کتاب کا نام ہوگا اور یہی قرآن لوح محفوظ میں تھا۔

قرآن مجید میں ہے۔

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ[1] مَّحْفُوْظٍ[2] (قرآن ایسی چیز نہیں جو جھٹلائی جا سکے) بلکہ وہ ایک باعظمت قرآن ہے جو لوح محفوظ میں (لکھا ہوا) ہے۔

سورۃ البروج آیت ۲۱۔۲۲

پ ۳۰

قرآن مجید سب سے پہلے لوح محفوظ میں تھا، کب سے اور کیسے لوح محفوظ میں تھا اس کی حقیقت اللہ کے سوا یا جس کو اللہ نے بتا دیا ہو کوئی دوسرا نہیں جان سکتا۔ قرآن میں ہے۔

---

[1] وقیل قوله تعالیٰ "فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ" إنّه نور یلوح للملائكة فیظهر لهم ما یؤمرون به فیاتمرون وقیل اللوح المحفوظ امّ الكتاب واللوح بالفتح كل صفیحة من خشب وكتف اذا كتب علیه یسمّی لوحا والجمع الواح (المصباح المنیر ج ۲ ص ۶۷۹) [2] بعض متکلمین نے کہا ہے کہ لوح محفوظ ایک ایسی چیز ہے جو ملائکہ پر روشن ہو جاتی ہے وہ اسے پڑھ لیتے ہیں اور چونکہ اخبار و آثار اس میں وارد ہیں اس لئے اسکی تصدیق واجب ہے، لوح محفوظ ایک ایسے مقام پر ہے جہاں جن وانس وشیاطین کا گزر محال ہے اسی لئے اس کو لوح محفوظ کہا جاتا ہے۔ قرآن حکیم کا لوح محفوظ میں ہونا إِنَّا نَحْنُ (باقی حاشیہ ص ۲۰ پر)

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ

بے شک یہ ایک مکرم قرآن ہے جو ایک پوشیدہ کتاب (لوح محفوظ) میں (درج) ہے نہیں ہاتھ لگاتے اس کو مگر پاک لوگ۔

سورۃ الواقعہ آیت ۷۷-۷۹ پ۲۷

اوپر لکھی ہوئی آیتوں میں لفظ قرآن اور کتاب سے اس طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کلام نازل ہوا ہے اس کو اتنا زیادہ پڑھا اور لکھا جائے گا کہ اس کی وجہ سے کسی زمانہ میں بھی اس کی حفاظت خطرہ میں نہیں پڑے گی۔ اسی طرح سورۃ البقرہ کے ابتدا میں لفظ "کتاب" کا استعمال کہ جس کے معنی نوشتہ کے ہیں اس طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ پیش کرنے والا اس کو شروع ہی سے لکھی ہوئی شکل میں پیش کرنا چاہتا ہے۔ اسی لئے شروع ہی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے لکھوانے کا اہتمام کیا۔

قرآن کا نزول

نزولِ قرآن کی بحث دوسری بحثوں کے مقابلہ میں اہمیت رکھتی ہے، کیونکہ قرآن پر ایمان لانے کے لئے یہ جاننا اور اس پر اعتقاد رکھنا

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹) نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (سورت الحجرات آیت ۹ پ۱۴) کے وعدے کی تکمیل ہے، جس کے معنی ہیں "ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم اس کے محافظ ہیں" سواطع القرآن ص ۴۹۔ (مولوی حافظ سید حمید شاہی امام)

ضروری ہے کہ یہ کلام اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے اور اسی نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کی تصدیق کی۔

نزول کے معنی

لغت میں لفظ نزول[1] جن معانی میں استعمال ہوتا ہے ان میں سے ایک معنیٰ ہیں کسی چیز کا اوپر سے نیچے کی طرف آنا مثلاً کہتے ہیں۔ نَزَلَ فُلَانٌ مِنَ الْجَبَلِ فلاں شخص پہاڑ سے اترا۔ اَنْزَلَ اور نَزَّلَ متعدی ہیں اور دونوں کا استعمال قرآن مجید میں کئی جگہ ہوا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ کلام بذریعہ وحی الٰہی نازل ہوتا تھا جس کو جبریل امین علیہ السلام لاتے تھے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے۔

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ

سورۃ الشعراء آیت ۱۹۲۔۱۹۵ پ۱۹

اور یہ قرآن رب العٰلمین کا بھیجا ہوا ہے اس کو امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے آپ کے قلب پر، صاف عربی زبان میں، تاکہ آپ من جملہ ڈرانے والوں کے ہوں۔

نزول وحی کی کیفیت

وحی کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ آپ کو گھنٹہ کی سی آواز سنائی

---

[1] نَزَلَ من علوٍّ الی سفل، ینزل نزولا ویتعدّی بالحرف والهمزة والتضعیف فیقال نزلت به وانزلته ونزّلته۔ قال ابن فارس التنزیل ترتیب الشیء (المصباح المنیر ج۲ ص۴۴)

دیتی تھی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حارث بن ہشامؓ نے ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یارسول اللہ آپؐ پر وحی کیسے نازل ہوتی ہے؟ آپؐ نے فرمایا کبھی کبھی میرے پاس گھنٹہ کی آواز کی طرح آتی ہے اور یہ میرے اوپر بہت سخت ہوتی ہے، جب یہ (گھنٹہ کی سی آواز) بند ہو جاتی ہے تو کہی ہوئی بات میں یاد کر لیتا ہوں۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا، میں نے دیکھا کہ سخت سردی کے دن آپؐ پر وحی نازل ہوتی تھی اور آپؐ کی پیشانی سے پسینہ ٹپکتا تھا، اور اگر آپؐ سواری پر ہوتے تو وہ سواری بوجھ کی وجہ سے زمین پر بیٹھ جاتی تھی۔

حضرت عبادہ بن الصامتؓ کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آتی تو آپؐ کو الجھن و بے قراری سی ہو جاتی اور چہرہ مبارک کا رنگ بدل جاتا تھا، آپؐ اس وقت سر جھکا لیتے اور جو صحابہ آپؐ کے پاس بیٹھے ہوتے وہ بھی سر نیچا کر لیتے تھے، پھر وحی کے بعد آپؐ سر اٹھا لیتے تھے۔ بخاری کی حدیث میں یہ الفاظ ہیں۔

وَاحیَاناً یاتِینِی مثلُ صَلصَلَۃِ الْجَرَسِ — اور کبھی مجھ پر وحی گھنٹہ کی آواز کی طرح آتی ہے۔

گھنٹہ کی آواز سے وحی کو اس لئے تشبیہ دی گئی کہ جس طرح گھنٹہ کی آواز کے لئے کوئی خاص جہت نہیں ہوتی بلکہ وہ ہر طرف اور ہر سمت سے سنائی دیتی ہے۔ اسی طرح وحی کی آواز کے لئے بھی کوئی خاص سمت اور طرف نہیں ہوتی تھی۔

یہ حقیقت ہے کہ سائنس کی ایجادات اور سائنسی علوم کی ترقی نے مذہب کی بہت سی باتوں کا سمجھنا آسان بنا دیا ہے، خلائی سفر میں حیرانگیز

تیز رفتاری سے بہت کم وقت میں لاکھوں میل کا سفر طے کر کے کامیابی سے واپس آجانا بہت سی ان گرہوں کو کھول دیتا ہے جن کا انسانی عقل نہ کھلنے والی گرہ سمجھ کر انکار کر دیتی تھی لیکن اب بہت سی باتیں لوگوں کی عقل و سمجھ میں آنے لگی ہیں اور وہ ان کو محال یا ناممکن نہیں کہتے۔

وحی کی دو قسمیں

"وحی متلو" وحی کی اس قسم کو کہا جاتا ہے کہ جس کی تلاوت کی جاتی ہے، اور وہ قرآنِ کریم ہے کہ جس کی آیتیں ہمیشہ کے لئے اس طرح محفوظ کر دی گئی ہیں کہ جن میں کسی قسم کا ردّو بدل ممکن نہیں ہے۔

"وحی غیر متلو" یہ وحی کی وہ قسم ہے کہ جس کی تلاوت نہیں کی جاتی قرآنی تعلیمات کی تفصیل و تشریح وحی غیر متلو کے ذریعہ کی گئی جو مستند احادیث کی شکل میں موجود ہیں۔

وحی اور الہام میں فرق

اگرچہ موضوع وحی اور الہام نہیں ہے، لیکن مختصر طور پر یہاں یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وحی[1] اور الہام دونوں کسی چیز

---

[1] مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے "وحی الٰہی" میں حافظ ابن قیم رح کی کتاب زاد المعاد کے حوالے سے وحی کی حسب ذیل صورتیں بیان کی ہیں۔

(۱) رویائے صادقہ (سچے خواب دیکھنا) (۲) نفث فی الروع یا القاء فی القلب (دل میں پھونکنا یا دل میں بات ڈالنا) (۳) صَلصَلَۃُ الجرس (گھنٹہ کی

(باقی حاشیہ ص ۲۴ پر)

کے معلوم کرنے یا معلوم ہوتے کا غیبی ذریعہ ہیں، لیکن الہام میں پتہ نہیں چلتا کہ یہ علم کہاں سے ہوا یا اس کا مبدأ کیا ہے۔ بخلاف وحی کے کہ اس میں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ علم کہاں سے ہوا۔ اس کے علاوہ ایک فرق یہ بھی ہے کہ الہام نبی اور غیر نبی دونوں کو ہوتا ہے لیکن وحی انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے، جس سے علم قطعی اور یقینی حاصل ہوتا ہے الہام اگر غیر نبی کو ہو تو اس سے علم قطعی اور یقینی نہیں ہوتا۔ اور اگر نبی کو ہو تو اس سے علم یقینی حاصل ہوتا ہے اور اس کا مبدء بھی معلوم ہوتا ہے۔ " وحی اور الہام میں یہ امر تو مشترک ہے کہ دونوں کسی چیز کے معلوم کر لینے کا ذریعۂ غیبی ہیں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ الہام ایک ایسا وجدان ہے جو نفس کو حاصل ہوتا ہے اور جس کے ذریعہ شئے مطلوب کا علم حاصل ہو جاتا ہے، لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ علم کا مبدء کیا ہے۔ گویا یہ وجدان بھوک، پیاس، غم اور خوشی کے وجدان کی طرح ہے۔ بخلاف وحی کے کہ اس میں علم کا مبدء پورے طور پر معلوم ہوتا ہے۔ پھر ان میں ایک مابہ الفرق یہ بھی ہے کہ الہام نبی اور غیر نبی دونوں کو ہوتا ہے لیکن وحی انبیاءؑ کے

(باقی حاشیہ ص ۲۳) آواز کی طرح آنا (۴) تمثّل (فرشتہ کا کسی شکل میں متشکل ہو کر نظر آنا) (۵) فرشتہ کا اپنی اصلی صورت میں نظر آنا (۶) وہ طریقۂ مکالمہ کہ جو معراج میں پیش آیا (۷) بلا واسطہ مکالمہ۔ تفصیل کے لئے "وحی الٰہی" ص ۳۰ تا ۶۰

" رویائے صادقہ صرف نبی کی ہدایت کے لئے ہیں، ان کے ذریعہ سے اصول تنزیلیت کی تلقین نہیں ہوتی، جس طرح طلوع آفتاب سے پہلے صبح صادق نمایاں ہوتی ہے اسی طرح نورِ نبوت کے ظہور سے پیشتر سچے خواب نظر آنے لگتے ہیں"
تاریخ القرآن ص ۱۳ از محمد اسلم جیراجپوری

ساتھ مخصوص ہے، کسی غیر کو علم کا یہ ذریعہ میسر نہیں ہو سکتا[1]۔

علماء نے کشف اور الہام میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ کشف کا تعلق حسّیات سے ہے اس میں کوئی چیز یا واقعہ آنکھوں سے نظر آجاتا ہے اور الہام کا تعلق وجدانیات سے ہے اس میں کوئی چیز نظر نہیں آتی صرف دل میں کوئی بات ڈال دی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ سمیع و بصیر ہے یعنی سننے اور دیکھنے والا ہے بلکہ تمام صفات حسنہ سے متصف ہے۔ لیکن وہ کیسے دیکھتا اور کیسے سنتا ہے اس کو بیان نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے کلام کی کیفیت بھی عقلِ انسانی کی رسائی سے بالاتر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات پر مفصّل بحث محکم و متشابہ کے بیان میں دیکھی جا سکتی ہے۔

لوحِ محفوظ سے رمضان المبارک کی ایک رات میں پورا قرآن مجید آسمانِ دنیا پر جیسے اللہ نے چاہا اتارا[2]۔ اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر رمضان کی لیلۃ القدر میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہونا شروع ہوا۔

قرآن مجید میں ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ	بے شک ہم نے قرآن کو شب قدر میں اتارا۔
سورۃ القدر آیت ۱ پ ۳۰	

سورۃ البقرہ میں ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ	ماہ رمضان ہے جس میں قرآن بھیجا گیا ہے جس کا

---

[1] وحی الٰہی ص ۲۶ ۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی

[2] یہ پہلا نزول بھی لیلۃ القدر میں ہوا تھا یہ نزول لوح محفوظ سے آسمان دنیا کے ایک مقام "بیت العزّۃ" پر ہوا۔

فِیْہِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ
سورۃ البقرہ پ۲ - آیت ۱۸۵

(وصف یہ ہے کہ) لوگوں کیلئے ہدایت ہے اور واضح الدلالۃ ہے، منجملہ ان کتب کے کہ جو ہدایت ہیں اور فیصلہ کرنے والی ہیں (بیان القرآن)

سورۃ الدخان میں ہے۔

حٰمٓ وَالْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَکَةٍ اِنَّا کُنَّا مُنْذِرِیْنَ
پ۲۵ آیت ۲

حم. قسم ہے اس کتاب واضح کی کہ ہم نے اس کو (لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر) ایک برکت والی رات (یعنی شب قدر) میں اتارا ہے۔ ہم آگاہ کرنے والے تھے۔

شب قدر جمہور اہل اسلام کے نزدیک رمضان المبارک کے آخری عشرہ کی کوئی طاق رات ہوتی ہے۔

محمد صلّی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کی ابتدا

قرآن مجید محمد صلّی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے اکتالیسویں سال آپؐ پر نازل ہونا شروع ہوا، یہ رمضان المبارک کی سترھویں رات تھی۔ آپؐ نبی بنائے جانے سے پہلے بھی غار حرا میں جا کر عبادت کرتے اور روزے رکھتے تھے۔

"اکثر پیغمبروں کے آغاز وحی کے حالات میں آپ کو یہ ملے گا کہ انھوں نے ایک زمانہ تک عبادت، مراقبہ میں بسر کی، ایک ایک مہینہ، ایک ایک چلّہ اسی طرح گذارا کہ وہ مادّی دنیا کی آلائشوں سے یکسر الگ ہو گئے۔ توراۃ میں حضرت موسیٰؑ کی نسبت ہے کہ کتاب ملنے سے پہلے وہ چالیس روز تک کوہ طور پر روزہ کی حالت میں رہے۔ اسی طرح انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کے

ؔ دی عریبین پرافٹ ص ۱۹ و ۲۰ - از ڈاکٹر عطار محی الدین The Arabian Prophet

متعلق ہے کہ وہ ایک سنسان جنگل میں چالیس روز تک روزہ رکھ کر عبادتوں میں مصروف رہے اور وحی سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا غارِ حرا میں مہینوں عزلت گزیں رہنا اور فکر و مراقبہ اور عبادت اور ریاضت میں مصروف رہنا سب کو معلوم ہے۔[۱]

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضؓ کی ایک روایت ہے جس سے نزول وحی کی ابتدا سے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہو جائیں گی اور اس کا حاصل یہ ہے کہ آپؐ پر وحی کی ابتدا اچھے خوابوں سے ہوئی، آپؐ جو خواب دیکھتے وہ صبح کے اُجالے کی طرح سچ نکلتا تھا۔ پھر آپؐ تنہائی پسند کرنے لگے، غارِ حرا میں جا کر آپؐ کچھ دن عبادت میں گذارتے، کھانے پینے کا سامان جو ساتھ لے جاتے اس کے ختم ہو جانے پر گھر واپس تشریف لاتے اور ضرورت کی چیزیں ساتھ لے جاتے، یہاں تک کہ غارِ حرا میں آپؐ پر حق کھل گیا۔ آپؐ کے پاس فرشتہ آیا اور اُس نے کہا پڑھو، آپؐ نے فرمایا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فرشتہ نے مجھ کو پکڑ کے اتنا دبایا کہ میں نڈھال ہو گیا، اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرشتہ نے تین مرتبہ آپؐ کو دبایا اور چھوڑ دیا اور تیسری بار[۲] دبانے کے بعد اُس نے ذیل میں لکھی ہوئی آیتیں پڑھیں اور آپؐ سے ان کو پڑھنے کے لیے کہا۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ	اے پیغمبرؐ آپؐ (قرآن) اپنے ربّ کا نام
خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ	لے کر پڑھا کیجئے جس نے (مخلوقات) کو

۱؎ سیرت النبی ج ۴ ص ۵ (مولانا سید سلیمان ندویؒ)

۲؎ دی اسپرٹ آف اسلام ص ۱۷ و ۱۸۔ از سید امیر علی
۲؎ The Spirit of Islam P. 17-18

عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ؕ

پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا، آپؐ (قرآن) پڑھا کیجئے اور آپؐ کا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم سے تعلیم دی، انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ جانتا نہ تھا۔

سورۃ العلق آیت ۱-۵ پ ۳۰

مذکورہ بالا آیات سب سے پہلے نازل ہوئیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان آیتوں کے ساتھ گھر واپس تشریف لائے، قلب مبارک پر لرزہ طاری تھا۔ فرمایا مجھے (خوب) اڑھا دو، مجھے (خوب) اڑھا دو، لوگوں نے آپؐ کو (کمبل یا چادر سے) خوب اڑھا دیا، یہاں تک کہ دہشت و گھبراہٹ کی حالت ختم ہو گئی، پھر آپؐ نے حضرت خدیجہؓ سے تمام ماجرا بیان کیا اور (بتقاضائے بشریت) فرمایا کہ مجھ کو اپنی جان کا خطرہ ہے، حضرت خدیجہؓ بولیں، ہرگز نہیں خدا آپؐ کو رُسوا نہیں کرے گا، اور یہ کہہ کر حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کی کچھ خوبیاں گنائیں، اور اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس آپؐ کو لے گئیں جو عہد جاہلیت میں عیسائی ہو گئے تھے، عبرانی زبان جانتے تھے اور (چند سال پیشتر) انجیل عبرانی زبان میں لکھتے تھے، جتنا بھی لکھ سکتے تھے، بوڑھے بہت تھے، دکھائی نہیں دیتا تھا، حضرت خدیجہؓ نے کہا ذرا اپنے بھتیجے کی تو سنو، آپؐ نے جو کچھ گذرا تھا اُن کو بتا دیا، اس پر ورقہ بولے "یہ تو وہی ناموس (راز دار یا محرم اسرار) ہے جس کو اللہ نے موسیٰؑ پر نازل کیا تھا، اے کاش میں اس وقت جوان ہوتا، اے کاش میں اس وقت تک زندہ رہتا جب کہ تمہاری قوم تم کو نکالے گی، آپؐ نے پوچھا کیا میری قوم مجھ کو

نکال دے گی؟ انھوں نے کہا ہاں، جو چیز تم لے کر آئے ہو وہ تو ایسی چیز ہے کہ اس کو لے کر جو بھی آیا اس کے ساتھ دشمنی کی گئی، اگر مجھے تمھارا وہ زمانہ مل گیا تو میں تمھاری بھرپور مدد کروں گا۔ اس واقعہ کے کچھ ہی عرصہ گزرنے کے بعد ورقہ کا انتقال ہو گیا۔ ادھر کچھ مدّت کے لیے وحی کا سلسلہ بھی رک گیا۔

عارضی طور پر سلسلۂ وحی بند رہنے کی مدّت

اس کے بعد تین برس تک آپؐ پر کوئی وحی نہیں آئی[1]۔ تین برس کے بعد وہی فرشتہ جو غارِ حرا میں پہلی بار وحی لایا تھا اس طرح سے نظر آیا کہ آپؐ پر رعب طاری ہو گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی حالت میں گھر واپس آئے اور فرمایا کہ مجھے (خوب) اڑھا دو، مجھے (خوب) اڑھا دو، آپؐ کو (کمبل وغیرہ) سے اڑھا دیا گیا، اس وقت آپؐ پر سورۃ المدّثر نازل ہوئی جس کی ابتدائی آیتیں یہ ہیں۔

يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ قُمْ فَأَنذِرْ ۙ	اے کپڑے میں لپٹنے والے اٹھو پھر
وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۙ	ڈراؤ اور اپنے رب کی بڑائیاں بیان کرو

---

[1] یہ مدّت تین سال یا اسکے قریب تھی اس کو فترۃ الوحی کا زمانہ کہا جاتا ہے، سیوطی نے لکھا ہے کہ فترہ کے بعد سب سے پہلے سورۃ المدثر نازل ہوئی۔ دو نبیوں یا دو رسولوں کے درمیان جو زمانہ ہوتا ہے اس کو بھی فترۃ کہا جاتا ہے۔ والفترۃ (ما بین کل نبیین) وفی الصحاح ما بین کل رسولین من رسل اللہ عزوجل من الزمان الذی انقطعت فیہ الرسالۃ۔ (تاج العروس ج ۳ ص ۴۶۳)

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ — اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو اور
سورۃ المدثر آیت ۱-۵ پ ۲۹ — بتوں سے الگ رہو۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ کپڑوں سے مراد یہاں نفس ہے، اور پاک رکھنے کا مطلب اعمال اور عادتوں کا سنوارنا اور درست کرنا ہے، ابن کثیر نے یہی تفسیر مجاہد سے نقل کی ہے۔

"اس کے بعد وحی کا سلسلہ برابر جاری رہا، وحی کا نزول اکثر تو کسی خاص واقعہ اور ضرورت کے پیش آنے پر ہوتا تھا اور کبھی یوں بھی ہوتا تھا، اکثر تین تین چار چار آیتیں ایک ساتھ اترتی تھیں، کبھی کبھی ایسا ہوا کہ دس دس آیتیں ایک ساتھ اتریں جب کوئی آیت اترتی تھی آپ کسی پڑھے لکھے صحابی کو بلوا کر وہ آیت لکھوا دیتے تھے[۱]"

آپ کی عمر کا تریسٹھواں سال تھا کہ ۱۰ھ میں عرفہ کے دن حجۃ الوداع کے موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًاؕ — آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے (ہر طرح) کامل کر دیا اور تم پر اپنا انعام تمام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لئے (ہمیشہ کو) پسند کیا (بیان القرآن، مولانا تھانویؒ)

سورۃ المائدہ آیت پ ۶

جو سب سے آخر میں نازل ہوا

اس بارہ میں علماء کے متعدد اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ آیت

---

[۱] مقالات شبلی (مذہبی) ص ۳ الاتقان کے حوالہ سے

ربوٰا کہ جس میں سود کے بقایا کے چھوڑ دینے کا حکم ہے سب سے آخر میں نازل ہوئی، دوسرا یہ کہ اس آیت کا نزول سب سے آخر میں ہوا ہے "وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (اور اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ کی پیشی میں لائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو اس کا کیا ہوا (اچھے اور بُرے کاموں کا) بدلہ پورا پورا ملے گا اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا)

تیسرا قول یہ ہے کہ جس آیت میں دَین (اُدھار) کا ذکر ہے وہ سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت ہے لیکن علماء نے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے۔ مذکورہ بالا اقوال کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے کے مخالف نہیں ہے اس لئے کہ وہ آیت کہ جس میں بقایا ربوٰ کو چھوڑ دینے کا حکم ہے اور وہ آیت کہ جس میں اللہ کے سامنے پیش ہوکر بدلہ دیئے جانے کا ذکر ہے اور تیسرے قول والی آیت یعنی آیت دَین کہ جس میں اُدھار کا معاملہ کرنے وقت یادداشت لکھ لینے کا حکم ہے۔ یہ تینوں آیتیں ایک ساتھ نازل کی گئی تھیں جو سورۃ البقرہ کے ختم سے کچھ پہلے اسی ترتیب سے موجود ہیں، لوگوں نے ان آیتوں میں بتائی ہوئی جس بات کو اس وقت اپنے خیال میں ضروری یا خاص سمجھا کہہ دیا کہ فلاں آیت کہ جس میں یہ حکم دیا گیا ہے یا یہ بات بتائی گئی ہے سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت ہے حالانکہ ان کا نزول ایک ہی ساتھ ہوا تھا اس سلسلہ میں علماء کے اور بھی اقوال ہیں لیکن طوالت کے خیال سے ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔

زمانہ نزول کی تقسیم

قرآن کے نازل ہونے کے زمانہ کو دو الگ الگ حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصّہ اس زمانہ سے تعلّق رکھتا ہے جس میں آپؐ کا قیام مکہ معظمہ میں تھا، یہ کل مدّت ساڑھے بارہ سال کے قریب ہوتی ہے۔ اور جس کا زمانہ ۱۷ رمضان ۴۱ سنہ ولادت نبوی سے شروع ہو کر ۱۲ ربیع الاول ۵۴ سنہ ولادت نبوی تک ختم ہو جاتا ہے۔ اس مدت میں مکّہ اور اس کے قریب قرآن مجید کا جو حصّہ نازل ہوا اس کو مکّی کہتے ہیں۔

دوسرا حصّہ ہجرت مدینہ کے بعد سے شروع ہوتا ہے، جس کی مدّت دس سال کے قریب ہے، اس زمانہ میں جو آیتیں اور سورتیں نازل ہوئیں ان کو مدنی کہتے ہیں قرآن مجید کا ۱۹/۳۰ حصہ مکی ہے اور ۱۱/۳۰ مدنی ہے۔

قرآن کی سورتوں کی تعداد

سورۃ الفاتحہ سے سورۃ الناس تک پورا قرآن رفتہ رفتہ تقریباً تیئیس (۲۳) سال کی مدت میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا گیا" قرآن مجید کی سورتوں کی کل تعداد ۱۱۴ ہے، جن میں پہلی سورۃ الفاتحہ ہے اور آخری سورۃ الناس ہے جیسا کہ مصحف عثمانی میں ہے[۱]۔

مکّی اور مدنی سورتوں میں فرق اور ان کی ظاہری پہچان

قرآن مجید کے نازل ہونے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا، دن میں بھی نازل ہوتا اور رات میں بھی، اسی طرح اس کے اترتے یا نازل

---

[۱] البرہان فی علوم القرآن للزرکشی متوفی ۷۹۲ھ ص ۲۵۱

ہونے کے لئے کوئی جگہ بھی مخصوص نہ تھی، مکہ، منیٰ، عرفات، طائف، حدیبیہ اور مدینہ وغیرہ میں مختلف مقامات میں قرآن مجید کی آیتیں اور سورتیں نازل ہوتی رہیں، کہیں کم اور کہیں زیادہ، لیکن جیسا کہ اوپر لکھا گیا زمانۂ نزول کے لحاظ سے ان کی دو قسمیں ہیں مکی اور مدنی، جو حصہ ہجرت مدینہ سے پہلے کہیں بھی نازل ہوا ہو اس کو مکی کہا جاتا ہے، اور جو ہجرت کے بعد کسی جگہ بھی اترا وہ مدنی ہے، اس تعریف کی بنا پر ہجرت کے بعد جو حصہ مکہ، عرفہ وغیرہ میں نازل ہوا وہ بھی مدنی ہوگا۔

"مکی اور مدنی کی تقسیم اگرچہ بظاہر مقامات نزول کے اعتبار سے معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت وہ زمانہ نزول کے اعتبار سے ہے، ہجرت کی تکمیل سے قبل کی آیات مکی ہیں اور بعد کی مدنی"[1] کون سی آیتیں یا سورتیں مکی ہیں اور کون سی مدنی، اس کے جاننے کا ذریعہ صرف صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ کے جانچے اور پرکھے ہوئے آثار واقوال ہیں اور ان ہی کے پیش نظر آیتوں اور سورتوں کو مکی یا مدنی کہا جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آیتوں اور سورتوں کے مکی یا مدنی ہونے کے متعلق کچھ ارشاد نہیں فرمایا اور نہ اس کا جاننا امت کے لئے ضروری قرار دیا، صحابہ کرامؓ کو اس کے خاص طور سے جاننے کی اس لئے ضرورت نہیں تھی کہ ان کو علم تھا کہ وحی نازل ہو رہی ہے اور کون سی آیتیں کب، کہاں اور کیوں نازل ہوئی ہیں، پھر بھی اگر کوئی بات سمجھنے سے رہ جاتی تو وہ بلا تکلف آپؐ سے پوچھ لیا کرتے تھے۔ مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے

---

[1] علوم القرآن ص ۲۶۔ تالیف مولانا محمد تقی عثمانی (مشہور پریس کراچی (پاکستان)

قسم کھا کر فرمایا کہ قرآن کی ہر سورۃ کے متعلق میں جانتا ہوں کہ وہ کہاں نازل ہوئی؟ اور قرآن کی جو آیت بھی نازل ہوئی ہے، مجھے علم ہے کہ وہ کیوں نازل ہوئی ہے اور (اس کے باوجود) اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ کتاب اللہ (قرآن) کا کوئی مجھ سے زیادہ جاننے والا اتنی دور رہتا ہے کہ مجھ کو اس کے پاس پہنچنے کے لئے اونٹ پر سفر کرنا پڑے گا تو میں اس کے پاس ضرور جاؤں گا۔[1]

مذکورہ بالا سطور سے واضح ہو گیا کہ مکّی اور مدنی کے پہچاننے کا قابل اعتماد ذریعہ صحابہؓ اور تابعینؒ کے وہ اقوال و آثار ہیں کہ جن کو پرکھ لیا گیا ہو، لیکن اصولِ تفسیر کے علماء نے چند باتیں ایسی بتائی ہیں کہ اگر ان کو ذہن میں رکھا جائے تو مکّی اور مدنی آیتوں اور سورتوں کا پہچاننا کسی قدر آسان ہو جاتا ہے۔ وہ ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ مکّی آیتیں عموماً چھوٹی ہوتی ہیں اور مدنی آیتیں عموماً بڑی ہوتی ہیں اور یہ ایک غالب خصوصیت ہے کہ بعض مکّی آیتیں بڑی بھی ہیں۔

۲۔ مکّی آیتوں میں زیادہ تر یَاۤ اَیُّهَا النَّاسُ کے الفاظ سے خطاب کیا گیا ہے اور مدنی میں عام طور پر یَاۤ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (اے ایمان والو) سے خطاب کیا گیا ہے۔[2]

---

[1] مناہل العرفان للزرقانی ص ۱۸۹

[2] اخرج ابو عبید فی فضائل القرآن عن میمون ابن مہران قال "ما کان فی القرآن یا ایہا النّاس او یا بنی آدم فانہ مکّی وما کان یا ایہا الذین آمنوا فھو مدنی" فان اردنا ان الغالب کذٰلک فصحیح
مناہل العرفان للزرقانی ص ۱۸۶ - ۱۸۷

۳۔ زیادہ تر مکی سورتوں میں انبیاء سابقین کے حالات، ان کی قوموں کے قصے، ان کی تاریخی آزمائشوں اور ان کی سزاؤں کا تذکرہ ہے کہ جو ان کو نافرمانی کی وجہ سے دی گئی تھیں، لیکن سورۃ البقرہ اس سے مستثنیٰ ہے[1]۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اُس کے ثبوت کی دلیلیں، عقیدۂ قیامت اور دوسرے بنیادی عقائد، عذاب وثواب، رجوع الی اللہ، دلوں کو صاف کرنے اور ان کو اچھے اخلاق کی طرف مائل کرنے کی ترغیب کہ جن کے بتانے، سمجھانے اور جن کی تکمیل کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھیجے گئے تھے مکّی سورتوں میں بیان کی گئی ہیں۔ فقہ کے فروعی احکام کی تفصیل زیادہ تر مدنی آیتوں میں ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ مکہ کے حالات کو دیکھتے ہوئے یہ ضروری تھا کہ پہلے لوگوں کو اسلام کی طرف بلایا جائے اور اس کی بنیادی باتیں اُن کے دل و دماغ میں بٹھائی جائیں، لیکن ہجرت مدینہ کے بعد مسلمانوں کی تعداد تیزی سے بڑھنے لگی اور ایسے سیاسی، سماجی اور مذہبی مسائل پیدا ہونے لگے کہ جن کو حل کرنے کے لئے قرآن کے تفصیلی احکام کی ضرورت تھی۔

۴۔ جس صورت میں لفظ کَلَّا (ہرگز نہیں) آیا ہے وہ مکّی ہے۔ کَلَّا پورے قرآن مجید میں پندرہ سورتوں میں تینتیس (۳۳) بار آیا ہے اور یہ سب سورتیں قرآن کے آدھے آخری حصہ میں ہیں[2]۔

---

[1] مناہل العرفان ص ۱۹۰

[2] مناہل العرفان للزرقانی ص ۱۹۰

۵۔ جن سورتوں میں آدمؑ اور ابلیس کا قصہ ہے وہ مکی ہیں، سورۃ البقرہ اس سے مستثنیٰ ہے[1]۔

۶۔ جن سورتوں میں حدود و فرائض بیان کیے گئے ہیں وہ مدنی ہیں[2]۔

۷۔ جن سورتوں میں جہاد اور ان کے احکام کا ذکر ہے وہ بھی مدنی ہیں[3]

مکّی اور مدنی سورتوں کی قسمیں

کبھی پوری سورۃ مکّی ہوتی ہے، مثلاً سورۃ المدثر پوری مکّی ہے اور کبھی پوری سورۃ مدنی ہوتی ہے جیسے کہ سورۃ آل عمران۔ قرآن مجید میں ایسی بہت سی سورتیں ہیں کہ جو پوری مکّی ہیں یا پوری مدنی ہیں اور ایسا بھی ہے کہ سورۃ تو مکّی ہے لیکن اس کی ایک یا ایک سے زائد آیتیں مدنی ہیں[4]۔ یا سورۃ مدنی ہے اور اس کی ایک یا چند آیتیں مکّی ہیں[5]، اس قسم کی سورتوں کے مکّی یا مدنی کہے جانے میں ان کی ابتدائی آیتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ سورۃ کی ابتدائی آیتوں کا نزول اگر ہجرت مدینہ سے پہلے ہو چکا تھا تو اس کو مکّی لکھا گیا ہے اور ظاہر کر دیا گیا ہے کہ اس میں کون کون سی

---

[1] مناہل العرفان للزرقانی ص ۱۹۰

[2] ایضاً

[3] ایضاً ص ۱۹۱

[4] مثلاً سورۃ الانعام مکّی ہے، لیکن اس کی بعض آیتیں مدنی ہیں۔

[5] مثلاً سورۃ الانفال مدنی ہے لیکن اس کی بعض آیتیں مکّی ہیں۔

آیتیں مدنی ہیں، اور اگر سورت کی ابتدائی آیتوں کا نزول ہجرت مدینہ کے بعد ہوا ہے تو اس کو مدنی لکھا گیا ہے اور ظاہر کر دیا گیا ہے کہ اس سورت میں کون کون سی آیتیں مکّی ہیں، اس کا صحیح طور پر اندازہ قرآن مجید کے دیکھنے سے ہو جائے گا۔

الاتقان میں ہے کہ ابوالحسن الحصّار[1] متوفی ۶۱۱ھ نے اپنی کتاب "الناسخ والمنسوخ" میں لکھا ہے کہ بیس[2] سورتوں کے مدنی ہونے پر علماء متفق ہیں، بارہ[12] سورتوں کے مکّی یا مدنی ہونے میں علماء کی رائے مختلف ہے اور ان کے سوا تمام سورتیں سب کے نزدیک مکی ہیں[2]۔

قرآن مجید کے نام

اصول تفسیر کے علماء نے قرآن کے بہت سے نام لکھے ہیں، زرکشی نے قاضی شیذلہ[3] سے قرآن کے پچپن[5] نام "البرھان فی علوم القرآن" میں نقل کئے ہیں ان میں سے چند مشہور نام یہ ہیں، الکتاب، القرآن، الفرقان الذکر، التنزیل، قرآن کے دو ناموں القرآن اور الکتاب کے متعلق سطور بالا

---

[1] علی بن محمد بن محمد بن ابراہیم ابوالحسن الحصّار "الناسخ والمنسوخ" کے علاوہ ان کی دیگر کتب بھی ہیں۔ اعلام ۵: ۱۵۱

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "الاتقان فی علوم القرآن" ج ۱ پہلی نوع

[3] شیذلة هو الفقيه الشافعی، ابوالمعالی۔ عزیزی (بفتح العین) مؤلف "البرهان فی مشكلات القرآن" توفّی سنة ۴۹۴ھ حاشیہ مباحث فی علوم القرآن۔

ڈاکٹر صبحی الصالح ص ۲۲ (استاذ الاسلامیات وفقه اللغة فی کلیة الاداب بالجامعة اللبنانیة)

ہیں لکھا جا چکا ہے کہ یہ کس طرف اشارہ کرتے ہیں۔

تَبَارَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ	بڑی عالیشان ذات ہے جس نے یہ فیصلہ
عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ	کی کتاب اپنے بندۂ (خاص) پر نازل
لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۙ	فرمائی تاکہ وہ تمام دنیا جہان والوں
سورۃ الفرقان آیت ۱ پ۱۸	کے لئے ڈرانے والا ہو۔

"الفرقان" یعنی حق و باطل میں فیصلہ کرنے والی یا فرق کرنے والی کتاب۔ قاضی البیضا متوفی ۶۸۵ھ نے الفرقان کہنے کی ایک وجہ یہ بھی لکھی ہے کہ اس کتاب کی آیتیں اور سورتیں متفرق طور پر بتدریج نازل کی گئی ہیں[1]

قرآن کا ایک نام اَلذِّکْر بھی ہے۔

وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ	اور یہ ذکر ہے برکت والا، آتارا ہے ہم نے
اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ	اس کو، کیا پس تم اس سے منکر ہو۔
سورۃ الانبیاء آیت ۵۰ پ۱۷	(ترجمہ شاہ رفیع الدینؒ)

اس کو اَلتَّنْزِیْل بھی کہا گیا ہے۔

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۗ	اور یہ (قرآن) رب العالمین کا بھیجا
نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۙ	ہوا ہے اس کو امانت دار فرشتہ
عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ	لے کر آیا ہے آپؐ کے قلب پر صاف
بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۗ	عربی زبان میں تاکہ آپؐ منجملہ ڈرانے
سورۃ الشعراء آیت ۱۹۲-۱۹۵ پ۱۹	والوں کے ہوں۔

---

[1] انوار التنزیل و اسرار التاویل المعروف بالتفسیر البیضاوی المنسوب الی الشیخ الکبیر قاضی البیضا عبداللہ بن عمر الشافعی ج ۲ ص ۹۱

تنزیل کا استعمال زیادہ تر کسی چیز کے بتدریج نازل کرنے کے لئے ہوتا ہے[۱]۔ قرآن کے ایک ہی بار نازل نہ کرنے میں اللہ تعالیٰ کی ایک عجیب و غریب حکمت مخفی تھی۔ وہ یہ کہ جب ایک چیز بتدریج ملتی ہے تو طبیعتیں آسانی سے قبول کرتی چلی جاتی ہیں، چنانچہ قرآن ایک ایک دو دو آیت کرکے اترتا گیا اور لوگ اس کو تسلیم کرتے گئے اگر ایک ہی بار اس کا نزول ہوتا تو ممکن تھا کہ بعض لوگ گھبرا جاتے، کیونکہ اس میں بہت سے فرائض اوامر اور نواہی ہیں جو یکبارگی ملنے کی صورت میں دلوں پر بار ہو جاتے[۲]"

یہ بھی ہوا ہے کہ ایک ہی مرتبہ میں کئی کئی آیتیں نازل ہوئی ہیں جیسا کہ گذشتہ سطور میں ذکر کیا گیا۔

قرآن کا جمع وترتیب

"جمع القرآن" سے کبھی قرآن کا حفظ کرنا اور اس کو بغیر دیکھے تلاوت کرنا مراد لیتے ہیں[۳]۔

جمع کے لغوی معنی متفرق چیزوں کو ملانے اور جوڑنے کے ہیں، حفظ

---

[۱] تاج العروس، فصل النون من باب اللام ص ۱۲۳

[۲] تاریخ القرآن۔ مولانا محمد اسلم جیراجپوری ص ۲۵۔ "الاتقان" میں ہے کہ "قرآن کا نزول ضرورت کے مطابق پانچ، دس یا اس سے زیادہ اور کم آیتوں کی تعداد میں ہوتا تھا۔ قصہ افک میں دس آیتوں کا ایک ساتھ نازل ہونا صحیح اقوال سے ثابت ہے"۔ [۳] مناہل العرفان للزرقانی ص ۲۳۲

کرنے یا زبانی یاد کرنے کے لئے حروف اور الفاظ کو ایک دوسرے سے ملانا اور جوڑنا پڑتا ہے اس لئے اس کو بھی جمع کہتے ہیں۔

قرآن مجید میں ہے۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ؕ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ ۚۖ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۚ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ؕ

سورۃ القیامہ آیت ۱۶-۱۹

پ ۲۹

(جب وحی نازل ہوا کرے تو آپؐ اس کے ختم ہونے سے پہلے) قرآن پر اپنی زبان نہ ہلایا کیجئے، اس خیال سے کہ آپؐ اس کو جلدی جلدی لیں۔ بے شک ہمارے ذمہ ہے اس کا (آپؐ کے قلب میں) جمع کر دینا اور اس کو (آپؐ کا) پڑھنا، تو جب ہم پڑھا کریں (یعنی ہمارا فرشتہ پڑھا کرے) تو آپؐ (بھی) اسی طرح سے پڑھا کیجئے، پھر اس کے بعد (آپؐ کی زبان سے) اس کا بیان کرا دینا (بھی) ہمارے ذمہ ہے (تاکہ آپؐ اس کو لوگوں تک پہنچا سکیں)

اس آیت میں لفظ جمع کے معنی زبانی یاد کرنے یا دل و دماغ میں محفوظ کر لینے کے ہیں اور اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تعلیم دی جا رہی ہے کہ جب فرشتہ وحی لے کر آیا کرے تو آپؐ اس خیال سے کہ کوئی بات یاد کرنے سے نہ رہ جائے عجلت سے کام نہ لیا کیجئے[1]، کیونکہ اس کا آپ

---

[1] سورۂ طٰہٰ میں ہے وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۡ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا (اور قرآن میں قبل اس کے کہ آپؐ پر اس کی وحی پوری نازل ہو چکے، عجلت نہ کیا کیجئے۔ اور آپؐ یہ دعا کیا کیجئے کہ اے میرے پروردگار میرا علم بڑھا دیجئے)

کو زبانی یاد کرا دینا اور آپؐ سے پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے، جب ہمارا فرشتہ پڑھا کرے تو پہلے آپؐ سنا کیجئے، پھر آپؐ بھی بالکل اسی طرح سے پڑھا کیجئے، صرف اتنا نہیں بلکہ آپؐ کو اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہماری ذمہ داری ہے تاکہ آپؐ وحی الٰہی دوسروں کو سنا اور سمجھا سکیں۔

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھنے لگے۔

مشہور مفسّر حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ نے "اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ" کی تفسیر میں لکھا ہے (اَیْ فِیْ صَدْرِكَ) یعنی ان آیتوں کا آپؐ کے سینے میں محفوظ کر دینا ہمارا کام ہے۔ ابن کثیرؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی وہ روایت بھی بیان کی ہے جس میں انھوں نے بتایا کہ وحی کے آنے کا وقت آپؐ پر بہت سخت گذرتا تھا اور مذکورہ بالا آیت کا شانِ نزول بیان کرتے وقت حضرت ابن عباسؓ نے اپنے شاگرد سعید بن جُبیرؒ (متوفی ۹۵ھ مشہور تابعی) سے کہا (دیکھو) میں اُسی طرح سے اپنے ہونٹ ہلاتا ہوں جس طرح کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے نازل ہوتے وقت اپنے ہونٹ ہلایا کرتے تھے، اور پھر روایت جب حضرت سعید بن جبیرؒ نے کی تو سننے والے سے کہا (دیکھو) میں بھی اپنے ہونٹ اسی طرح ہلاتا ہوں جیسے کہ میں نے یہ روایت کرتے وقت ابن عباسؓ متوفی ۶۸ھ کو ہونٹ ہلاتے ہوئے دیکھا تھا۔[1]

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۴۴۹

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صحابۂ کرامؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کس قدر غور و توجہ سے سنتے اور کس اہتمام سے دوسروں تک پہنچاتے تھے۔

تفسیر بیضاوی میں بھی اس آیت کی تفسیر میں جمع سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے میں آیتوں کا محفوظ کر دینا مراد لیا گیا ہے۔[۱]

زرقانی متوفی ۱۱۲۲ھ کی "مناہل العرفان" میں ہے۔

كَلِمَةُ جَمْعِ الْقُرْآنِ تُطْلَقُ تَارَةً وَيُرَادُ مِنْهَا حِفْظُهُ وَاسْتِظْهَارُهُ فِي الصُّدُوْرِ وَتُطْلَقُ تَارَةً أُخْرَى وَيُرَادُ مِنْهَا كِتَابَتُهُ كُلُّهُ حُرُوْفًا وَكَلِمَاتٍ وَآيَاتٍ وَسُوَرًا وَهٰذَا جَمْعٌ فِي الصَّحَائِفِ وَالسُّطُوْرِ وَذَاكَ جَمْعٌ

"جمع القرآن" مطلق بول کر کبھی قرآن کا حفظ اور اس کو دیکھے بغیر پڑھنا مراد لیا جاتا ہے اور کبھی مطلق بول کر پورے قرآن کے حروف، کلمات، آیات اور سورتوں کا لکھنا مراد لیا جاتا ہے اور اس کو صحیفوں میں اور سطروں میں (لکھ کر) جمع کرنا کہا جاتا ہے اور اس (پہلے) کو دلوں

---

[۱] ملاحظہ ہو تفسیر آیات لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ۝ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۝ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ

(انوار التنزیل و اسرار التاویل المعروف بالتفسیر البیضاوی المنسوب إلی الشیخ الکبیر البحر الذخار بجواہر التفسیر قاضی البیضا عبداللہ بن عمر الشافعی المتوفی ۶۸۵ھ ج ۲ ص ۴۰۰)

فِی الْقُلُوْبِ[1] میں جمع کرنا کہتے ہیں۔

اور کبھی جمع القرآن سے جیسا کہ سطور بالا میں گذرا، قرآن کے حروف، کلمات، آیتوں اور سورتوں کو لکھ کر ایک جگہ جمع کرنا مراد لیتے ہیں۔

اب جمع القرآن کے دونوں معنی کو ذرا تفصیل سے لکھا جاتا ہے جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ جس قدر توجہ قرآنِ کریم کے سیکھنے، سکھانے، اس کو زبانی یاد کرنے، اس کے لکھنے اور اس کے ترتیب دینے پر شروع سے کی گئی ہے، اتنی کسی آسمانی کتاب پر نہیں کی گئی، جس کا کھلا نتیجہ یہ نکلا کہ آج مسلمانوں کے ہاتھوں میں وہی قرآن ہے کہ جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا، لیکن توریت اور انجیل وغیرہ کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنی اصلی حالت پر ہیں۔ قرآن مجید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قیامت تک باقی رہنے والا معجزہ ہے۔

جمع القرآن کے پہلے معنیٰ

جمع القرآن کے پہلے معنیٰ یعنی اس کو زبانی یاد کرنا یا دل ودماغ میں محفوظ کر لینا، اس لحاظ سے سب سے پہلے حافظ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، پھر آپؐ کے بعد قرآن کو زبانی یاد کرنے والے صحابۂ کرامؓ کی ایک بڑی تعداد ہے جس کا اندازہ قرطبیؒ[2] متوفی ۶۷۱ھ

---

[1] مناہل العرفان ص ۲۳۲ [2] محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح ابو عبداللہ الانصاری الخزرجی الاندلسی، ابو عبداللہ القرطبی من کبار المفسرین، من کتبہ الجامع لاحکام القرآن عشرون جزءًا یعرف بتفسیر القرطبی

کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بیر معونہ کی جنگ میں ستّر قرار[1] شہید ہوئے تھے۔[2]

قرآن کو زبانی یاد کرنے کا اہتمام

قرآن کی حفاظت کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے کہ جو عربوں کی بہت سی خصوصیات کے نسلاً وارث و حامل تھے قرآن کو نہ صرف فصاحت و بلاغت بلکہ ہر اعتبار سے ایک معیاری کتاب پایا اور ان کو یقین ہوگیا کہ اس کی تعلیمات پر عمل کرنے سے ہماری سماجی اور اخلاقی زندگی میں سدھار پیدا ہوگا، ہماری دنیا اور دین دونوں اس سے بن جائیں گے اور اس کے آثار ان کو بالکل شروع ہی میں نظر آنے لگے تھے۔ اسلامی تاریخ کی مستند کتابوں میں ہے کہ عرب کے مشہور شاعر لبید بن ربیعہ نے اسلام قبول کرنے کے بعد اس لئے شعر کہنا چھوڑ دیا کہ اس کو اشعار کی فصاحت و بلاغت میں وہ لذت و کشش محسوس نہ ہوتی تھی جیسی کہ قرآن کے پڑھنے اور سننے میں۔ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ نے لبید بن ربیعہ سے کہا کہ کچھ اپنے اشعار سناؤ، تو اس نے عرض کیا کہ میں نے جب سے سورۃ البقرہ اور سورۃ آل عمران پڑھی ہیں اس وقت سے شعر کہنا چھوڑ دیا ہے۔

قرآن کے نزول کے ساتھ صحابہ کرامؓ کے ایمان و یقین میں

---

[1] اس دور میں قاری عام طور پر حفّاظ ہوتے تھے۔

[2] الاتقان بیسویں نوع ص ۸۲ (عربی)

پختگی آرہی تھی، وہ بڑے ذوق وشوق سے نازل شدہ آیتوں کو زبانی یاد کرتے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ رضؓ کو قرآن پڑھاتے، زبانی یاد کراتے اور ان سے سنتے رہتے تھے جو صحابہؓ اچھے انداز میں قرآن پڑھتے آپؐ ان کی تعریف فرماتے۔

قرآن پڑھنے میں صحابہؓ کی سبقت

قرآن کے پڑھنے اور پڑھانے میں صحابہ کرامؓ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے، زبانی یاد کرنے میں انتہائی کوشش سے کام لیتے اور گھروں میں اپنی بیوی بچوں کو اس کی تعلیم کا اہتمام کرتے۔ رات کے وقت ان کے گھروں کے پاس سے گذرنے والا تلاوت کی گنگناہٹ سن سکتا تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انصار کے گھروں کے پاس سے گذر ہوتا تو آپؐ قرآن سننے کے لئے کچھ دیر کے لئے ٹھہر جاتے۔ مسلم میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا، کیا اچھا ہوتا کہ گذشتہ رات تم مجھے دیکھ لیتے جب کہ میں تمہاری قرارت سن رہا تھا، ایسا لگتا ہے کہ تم کو لحنِ داؤدی عطا کی گئی ہے[۱]۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ابوموسیٰ اشعریؓ نے عرض کیا،

---

[۱] عن ابی موسیٰؓ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لابی موسیٰ لو رأیتنی وانا أستمعُ قراءتک البارحۃ لقد اوتیتَ مِزمارًا من مزامیر آل داؤد۔ مسلم ج ۱ ص ۲۶۸ - اسی طرح (باقی حاشیہ ص ۴۶ پر)

یا رسول اللہؐ! اگر مجھے علم ہو جاتا کہ آپؐ سن رہے ہیں تو میں اور زیادہ سنوار کر پڑھتا[1]۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ خوش الحانی ان کے قبیلہ کا وصف امتیازی تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے "رات کو جب قبیلۂ اشعری کے لوگ آتے ہیں تو میں ان کی قرآن خوانی ہی سے ان کی جائے قیام کو پہچان لیتا ہوں[2]۔

بدرالدین زرکشیؒ نے لکھا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ حیات میں صحابہؓ کی ایک جماعت نے پورا قرآن زبانی یاد کر لیا تھا اور متفرق طور پر تو صحابہؓ میں سے اتنے لوگوں کو یاد تھا کہ ان کی کم سے کم تعداد تواتر کی حد تک پہنچ جاتی ہے[3]۔

جلال الدین سیوطیؒ نے الاتقان میں بہت سے ناموں میں سے بعض انصار و مہاجر صحابہؓ اور صحابیاتؓ کے مندرجہ ذیل نام

(بقیہ ص ۴۵) کی روایت بخاری میں بھی ہے۔ عن ابی موسیٰؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لہ یا ابا موسیٰ لقد اوتیت مزماراً من مزامیر آل داؤد بخاری ج ۲ ص ۷۵۵ [1] التبیان فی علوم القرآن ص ۵۶، ۵۷ لمحمد علی الصابونی الاستاذ بکلیۃ الشریعۃ والدراسات الاسلامیہ بمکۃ المکرمۃ (مسلم ج ۲ ص ۳۰۳ پر پوری حدیث درج ہے [2] اسوۂ صحابہ حصہ اول ص ۱۲۲ مسلم کتاب الفضائل کے حوالہ سے باب من فضائل الاشعریین (مسلم ج ۲ ص ۳۰۳ پر پوری حدیث درج ہے [3] البرہان فی علوم القرآن للزرکشی ج ۱ ص ۲۴۱

قاسم بن سلام ابو عبید متوفی ۲۲۴ھ کی "کتاب القراءات" کے حوالہ سے ذکر کئے ہیں۔

مہاجرین حفاظ صحابہؓ وصحابیاتؓ

حضرت ابو بکر صدیق رضؓ، حضرت عمر فاروق رضؓ، حضرت عثمان غنی رضؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہ رضؓ، حضرت سعدؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت حذیفہؓ، حضرت سالمؓ مولیٰ ابی حذیفہؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن السائبؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ، حضرت عائشہ رضؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت ام سلمہ رضؓ۔

انصار حفاظ صحابہؓ

حضرت عبادہ بن الصامتؓ۔ حضرت معاذ رضؓ (جن کی کنیت ابو حلیمہ تھی) حضرت مجمع بن جاریہؓ، حضرت فضالہ بن عبیدؓ، حضرت مسلمہ بن مخلد رضؓ، ابو عبید نے اس کی تصریح بھی کر دی ہے کہ ان میں سے بعض صحابہ رضؓ نے حفظ قرآن کی تکمیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کی[1]

ان کے علاوہ صحابہ کرامؓ میں سے یہ لوگ بھی حافظِ قرآن تھے۔ حضرت تمیم الداریؓ، حضرت عقبہ بن عامر رضؓ، حضرت عبداللہ

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن ترجمہ از عربی ص ۲۰۳

بن زبیر رضؓ، حضرت ابوایوب انصاری رضؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعری رضؓ۔

صحابہ رضؓ اور صحابیات رضؓ میں حفاظ قرآن کی ایک بڑی تعداد ہیں سے کہ جن کو قرآن زبانی یاد کرنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شاگردی کا فخر حاصل ہے۔ قاسم بن سلاّم ابو عبید نے بہت سے نام لکھے ہیں، لیکن صحابہ رضؓ میں سے جن لوگوں نے بطور خود قرآن یاد کیا ان کا شمار کرنا مشکل ہے، اور اگر ان لوگوں کو بھی شامل کرنے کی کوشش کی جائے کہ جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد قرآن زبانی یاد کیا، تو شمار کرنا اور زیادہ مشکل ہو گا۔[1]

زرقانی (متوفی ۱۱۲۲ھ) نے درج ذیل حفاظ مہاجرین رضؓ وانصار رضؓ صحابہ رضؓ کے نام لکھے ہیں۔

حضرت عمرو بن العاص رضؓ، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضؓ، حضرت معاویہ رضؓ، حضرت زید بن ثابت رضؓ، حضرت ابوالدرداء رضؓ، حضرت انس بن مالک رضؓ، حضرت ابوزید رضؓ، حضرت اُبی بن کعب رضؓ، حضرت معاذ بن جبل رضؓ۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ کو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن یاد کرانے اور ان کی قرارت کو پسند فرماتے تھے، اپنے مرض الموت میں انھیں سے قرآن پڑھوا کر سنا کرتے تھے، یہاں تک کہ تقریباً

---

[1] مباحث فی علوم القرآن ص ۶۷ از ڈاکٹر صبحی الصالح - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ حیات میں اور آپ کی وفات کے بعد صحابۂ کرام دور و دراز علاقوں میں پھیل گئے تھے۔ اس لئے صحابہ رضؓ اور صحابیات رضؓ میں سے حفاظ کی تعداد کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

سارا قرآن انھوں نے آپؐ کو سنایا۔[1]

صحابۂ کرامؓ میں سے یہ لوگ قرآن پڑھانے میں زیادہ مشہور تھے۔

حضرت عثمان بن عفانؓ، حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ، حضرت اُبی بن کعبؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابو الدرداءؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ۔[2]

مشہور حفاظ صحابہؓ میں سے کچھ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں موجود رہتے اور کچھ آپؐ کے حکم سے قرآن کی تعلیم کے لئے شہروں اور قصبوں میں چلے جاتے، ہجرت مدینہ سے پہلے آپؐ نے حضرت مصعبؓ بن عمیر اور حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ کو قرآن کی تعلیم کے لئے مدینہ بھیجا اور ہجرت کے بعد حضرت معاذ بن جبلؓ کو قرآن پڑھانے اور زبانی یاد کرانے کے لئے مکہ بھیجا۔[3]

حضرت اُبی بن کعبؓ نے بہت سے صحابہؓ کو قرآن پڑھایا اور زبانی یاد کرایا، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، اور حضرت عبداللہ بن السائبؓ ان ہی میں سے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حضرت زید بن ثابت انصاریؓ سے بھی قرآن پڑھا تھا۔ تابعینؒ میں سے جن لوگوں نے صحابۂ کرامؓ سے قرآن پڑھا اور حفظ کیا اُن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔[4]

---

[1] تاریخ القرآن مولانا جیراجپوری ص ۴۸

[2] مباحث فی علوم القرآن ص ۶۸۔ ڈاکٹر صبحی الصالح۔

[3] التبیان فی علوم القرآن لمحمد علی الصابونی ص ۵۶

[4] مباحث فی علوم القرآن ص ۶۰۔ ڈاکٹر صبحی الصالح

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی امّت کی یہ ایک اعلیٰ ترین خصوصیت ہے کہ قرآن پاک اس کے بے شمار لوگوں کے سینوں میں محفوظ ہے۔ شروع ہی سے اس کو محفوظ کرنے میں صرف تحریر پر نہیں بلکہ زبانی یاد کرنے پر بھی بہت توجہ دی گئی۔

اہلِ کتاب میں توراۃ اور انجیل زبانی یاد رکھنے والے دیکھنے میں نہیں آتے، وہ اگر اپنی آسمانی کتابوں سے کچھ یاد بھی کرتے ہیں تو ان کا اعتماد زیادہ تر لکھی ہوئی کتابوں پر ہوتا ہے جن کو وہ عام طور پر دیکھ کر پڑھتے ہیں نہ کہ زبانی، اور یہی وجہ ہے کہ وہ کتابیں اپنی اصلی حالت پر باقی نہ رہ سکیں، برخلاف اس کے قرآنِ کریم کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا زبانی یاد کرنا آسان فرما کر اپنے وعدہ کے مطابق اس کی حفاظت فرمائی۔[1]

"حجۃ الوداع میں ایک لاکھ پچیس ہزار مسلمانوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کا فخر حاصل تھا، اور ان کے سوا لاکھوں کی تعداد میں تمام عرب میں مسلمان پھیلے ہوئے تھے، ہر مسلمان پر پانچ وقت کی نماز میں پڑھنا لازمی تھا، جن میں ایسے مسلمان بھی کثرت سے تھے جو رات کے آخر حصے میں جاگتے اور قرآن پڑھتے، آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم سے ہزاروں مسلمانوں نے نماز میں قرآن بارہا سنا بلکہ اس کثرت سے سنا گیا کہ بعض کو سنتے سنتے پوری سورتیں یاد ہو گئی تھیں، ہر رمضان میں پورے قرآن کا آپ دور کرتے جس

---

[1] التبیان فی علوم القرآن لمحمد علی الصابونی ص ۵۷-۵۸

ہیں صحابہ رضؓ بھی شریک ہوتے۔ ہزاروں صحابہ رضؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی قرآن پڑھایا۔[1]

عربوں کا قوّت حافظہ پر اعتماد

عربوں کی یہ پرانی عادت تھی کہ وہ اپنی یاد رکھنے کی قوّت پر زیادہ بھروسہ کرتے تھے اور کسی چیز کا لکھ کر یاد رکھنا اُس دَور کے معاشرہ میں اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ایک ایک شخص ہزاروں اشعار بڑی آسانی سے یاد کر لینا اور مختلف مواقع پر لوگوں کو سناتا تھا، اور یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان آج بھی ٹکسالی مانی جاتی ہے، ان میں بہت کم ایسے تھے کہ جن کو قدیم تاریخی واقعات بڑی تعداد میں اشعار اور صدیوں پہلے گزرے ہوئے لوگوں کے حسب ونسب یاد نہ ہوں، انسانوں کے علاوہ وہ تو اونٹوں اور گھوڑوں کے نسب کو بھی یاد رکھتے تھے، لڑائیوں کے واقعات مع تاریخ وغیرہ یاد رکھتے تھے۔

عرب میں کتابت کی ابتدا

تاریخ بتاتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج ہو چکا تھا۔

عرب کے مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ مکہ میں کتابت کی ابتدا

---

[1] تاریخ القرآن از مولانا عبداللطیف رجانی ص ۹۸ - ۹۹

حرب بن امیہ بن عبد شمس سے ہوئی جو سفر پر مکہ سے باہر جاتا رہتا تھا، دورانِ سفر میں اُس نے کچھ لوگوں سے لکھنا سیکھا ان میں بشر بن عبدالملک کا نام خاص طور سے قابلِ ذکر اس لئے ہے کہ بشر بن عبدالملک ایک مرتبہ حرب بن امیہ کے ساتھ مکہ آیا، اسی عرصہ میں اس کی شادی حرب بن امیہ کی لڑکی صہباء سے ہوگئی، وہاں اس نے کچھ عرصہ ٹھہر کر بہت سے لوگوں کو لکھنا سکھایا، اور پھر وہ مکہ سے چلا گیا۔[1]

علامہ ابنِ خلدون کا رجحان اس طرف ہے کہ اہلِ حجاز نے لکھنا حیرہ کے لوگوں سے سیکھا اور حیرہ کے لوگوں نے تبابعہ اور اہلِ حمیر سے لکھنا سیکھا۔[2]

رفتہ رفتہ مکہ اور اس کے اطراف میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد

---

[1] تاریخ القرآن عربی ابوعبداللہ الزنجانی ص ۲۵

"حجاز میں سب سے پہلے حرب بن امیہ نے اپنے ایک رشتہ دار سے جو بادشاہ حیرہ کے دربار میں رہتا تھا کتابت اخذ کی، اس کے بعد چند دیگر اشخاص نے جن میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب بھی تھے، اس کو سیکھ لیا، لیکن یہ لوگ صرف اس قدر لکھنا جانتے تھے کہ اپنی تجارت کے کاروبار کا ضروری حساب وکتاب لکھ سکیں، نہ کوئی باقاعدہ اس کی تعلیم تھی نہ شوق تھا (تاریخ القرآن جیراجپوری ص ۸) [2] مقدمہ ابن خلدون (متوفی ۸۰۸ھ) ص ۳۶۵ (عبدالرحمن بن محمد بن محمد ابوزید ولی الدین الحضرمی الاشبیلی) الاعلام ج ۴ ص ۱۰۶

حیرۃ ایک شہر کا نام ہے کہ جو کوفہ سے چند میل کے فاصلہ پر تھا۔

بڑھتی گئی، یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عرب میں پڑھے لکھے لوگوں کی خاصی تعداد موجود تھی۔

تاریخ القرآن میں تاریخ کے حوالہ سے اکتالیس (۴۱) ایسے مہاجرینؓ وانصار صحابہؓ کے کہ جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے، نام گنانے کے بعد لکھا ہے۔

"بہرحال اس میں شک نہیں کہ اسلام کے کچھ قبل عرب میں اس کا (لکھنے پڑھنے کا) رواج ہو گیا تھا[۱] اور جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں اس کو بہت ترقی دی، بدر کی جنگ میں جو ستّر آدمی کفار مکہ کے مسلمانوں نے گرفتار کیے تھے ان میں جس پاس اس قدر مال نہ تھا کہ اپنی رہائی کے لئے فدیہ ادا کرتا اس کی رہائی کا یہ فدیہ مقرر کیا گیا کہ ان میں سے ہر ایک اہلِ مدینہ کے لڑکوں میں سے دس دس لڑکوں کو لکھنا سکھائے، چنانچہ زید بن ثابتؓ نے اسی طور سے لکھنا سیکھا[۲]۔

یہ بات عقل میں نہیں آتی کہ جن عربوں کی تجارت ایران، چین اور ہند کی بندرگاہوں تک پھیلی ہوئی تھی وہ تمام تجارتی کاروبار زبانی طور پر کرتے ہوں گے، کیونکہ تجارتی لین دین میں دوسروں کو مطمئن کرنے کے لئے لکھت پڑھت کرنا ہی پڑتی ہے، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ذاتی کاموں میں وہ اپنی یادداشت پر بھروسہ کرتے ہوں۔ تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ حدیبیہ میں صلح نامہ لکھا گیا، اہلِ مکہ نے

ازٹامس کارلائل۔

[۱] ادن ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ ص ۶۹،

[۲] تاریخ القرآن ص ۴-۵ — ازمولانا مفتی عبداللطیف رحمانی۔

[a] On Heroes and Hero-worship p. 64

ایک معاہدہ لکھ کر بیت اللہ میں لٹکایا، سبعہ معلقہ لکھوا کر خانۂ کعبہ پر لٹکایا گیا، توریت وانجیل لکھی ہوئی ان میں موجود تھی۔[۱]

جمع القرآن کے دوسرے معنی

"جمع القرآن" کی اس کے دوسرے معنی کے پیشِ نظر آسان تعبیر "قرآن کے لکھنے" سے کی جاسکتی ہے۔

"جمع کے معنی ضم اور تالیف کے ہیں جو کتاب کے ہم معنی ہے، نہ کہ حفظ اور یاد کے۔ البتہ حفظ پر جمع کا استعمال مجاز ہے نہ کہ حقیقت[۲]"۔

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں گذرا کہ سورۃ البقرہ کی ابتدائی آیت میں لفظ کتاب کا استعمال جس کے (معنی (نوشتہ کے ہیں) اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ پیش کرنے والا شروع ہی سے اس کو لکھی ہوئی شکل میں پیش کرنا چاہتا ہے۔

الٓمّٓ ج ذٰلِكَ الْكِتٰبُ[۳] لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ ج هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۔ سورۃ البقرہ آیت ۱۔۲ پ ۱

یہ کتاب ایسی ہے کہ جس (کے اللہ کی طرف سے ہونے) میں کوئی شک نہیں، راہ بتلانے والی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو۔

---

[۱] تاریخ القرآن ص ۷۔ (مولانا مفتی عبداللطیف رحمانی

[۲] ایضاً ص ۴۸

[۳] (والکتاب ما یکتب فیہ) تاج العروس فصل الکاف من باب الباء ص ۴۴۴
" وتطلق الکُتُبۃ والکتابُ علی المکتوب، ویطلق الکتاب علی المُنَزَّلِ وعلی ما یکتبہ الشخص ویُرسلہ" المصباح المنیر ص ۶۲۳

یہی وجہ ہے کہ جس ماحول میں لوگ عام طور سے لکھنے پڑھنے کی طرف توجہ کم کرتے تھے، قرآن کو زبانی یاد کرنے کے ساتھ ساتھ ابتداءہی سے اسکے لکھنے اور لکھوانے کا اہتمام کیا گیا، جس کی وجہ سے قرآن کو دنیا کی دیگر کتب کے مقابلہ میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ پوری طرح سے اب تک محفوظ ہے، اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو نہ صرف مسلمان بلکہ دوسرے مذاہب کے علماء اور فضلاء بھی تسلیم کرتے ہیں۔

قرآن مجید کا لکھا جانا

قرآن مجید کے لکھنے کا اہتمام تین مرتبہ کیا گیا اور ہر مرتبہ کی کچھ نہ کچھ خصوصیات ہیں۔

پہلی مرتبہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں۔
دوسری مرتبہ۔ حضرت ابو بکر صدیق رض کے زمانہ خلافت میں۔
تیسری مرتبہ۔ حضرت عثمان رض کے زمانہ خلافت میں

عہد رسالت میں پہلی بار قرآن کا جمع اور اس کی ترتیب

پہلے پیغمبروں پر جو کتابیں نازل کی گئی تھیں ان کو لکھ کر محفوظ کیا جاتا تھا، قرآن بھی آسمانی کتاب ہے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے صرف یاد کر لینے کو کافی نہیں سمجھا بلکہ پرانے

طریقہ کو جاری رکھا، آپؐ نے وحی الٰہی لکھنے کے لئے صحابہ رضؓ میں سے کچھ خاص لوگوں کو اس اہم خدمت کے لئے منتخب فرمالیا تھا جن میں سے چند یہ ہیں۔

حضرات خلفاء اربعہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین، حضرت زید بن ثابت رضؓ، حضرت اُبیّ بن کعبؓ، حضرت معاذ بن جبل رضؓ، حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ، حضرت سعید بن العاصؓ، حضرت ابان بن سعیدؓ، حضرت خالد بن ولید رضؓ، حضرت ثابت بن قیسؓ، حضرت عبد اللہ بن ارقم رضؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ وغیرہم رضؓ۔

صحیح بخاری میں ہے۔

عن قتادۃؓ سالت انس بن مالکؓ من جمع القراٰن علیٰ عھد النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اربعۃ کلھم من الانصار، اُبی بن کعبؓ و معاذ بن جبلؓ وزید بن ثابتؓ وابو زیدؓ [1]

قتادہ رضؓ کہتے ہیں کہ میں نے انس بن مالکؓ سے پوچھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن کس نے جمع کیا، انھوں نے کہا چار آدمیوں نے اور وہ چاروں انصاری تھے، ابی بن کعبؓ، معاذ بن جبل رضؓ، زید بن ثابت رضؓ اور ابو زیدؓ (رضوان اللہ علیہم اجمعین)

بخاری کی دوسری روایت میں ابی بن کعبؓ کی بجائے ابو الدرداءؓ

---

[1] بخاری ج ۲ ص ۷۴۸، ابواب فضائل القرآن، باب القراء من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

کا نام ہے[1]

اس روایت میں حضرت قتادہؓ حضرت انس بن مالکؓ سے قرآن کے لکھنے والوں کے متعلق سوال کر رہے ہیں، جس کے جواب میں حضرت انسؓ نے اپنے علم کے مطابق فرمایا کہ چار آدمی تھے کہ جنھوں نے قرآن جمع کیا اور چاروں انصاری تھے، یہاں جمع سے مراد پورے قرآن کا لکھنا ہے، ورنہ چار کی تخصیص بے معنیٰ ہو گی، کیونکہ قرآن مجید کا کچھ نہ کچھ حصّہ لکھنے والے بہت سے صحابہؓ تھے، ممکن ہے کہ چار کی یہ تخصیص حضرت انسؓ نے کتابت (لکھنے) کے کسی خاص معیار کے پیش نظر کی ہو اور جو لوگ ان کے خیال میں اس معیار پر پورے اترتے تھے ان کے نام گنا دئے ہوں، حالاں کہ صحابہؓ میں سے جن لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں پورا قرآن لکھ لیا تھا، ان کی تعداد چار سے کہیں زیادہ تھی، جیسا کہ آئندہ سطور سے ظاہر ہو جائے گا۔

عقل اس بات کو آسانی سے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے کہ حضرت قتادہؓ کا سوال حفّاظ قرآن کے بارے میں تھا، اس لئے کہ اُس دور میں قرآن کے حافظوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، کیونکہ صرف بیر معونہ کی جنگ میں شہید ہونے والے قرّار (حفاظ) کی تعداد سَتّر کے قریب تھی، تو کُل قرّار یقیناً اس سے زیادہ ہوں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حفاظت قرآن

---

[1] بخاری ج ۲ ص ۷۴۸ (یہ روایت حضرت انسؓ بن مالک سے ہے۔

کی امکانی تدابیر شروع ہی سے اختیار فرمائی تھیں، یہ بات قرین عقل و قیاس نہیں کہ آپؐ نے تمام قرّاء کو جنگ پر بھیجدیا ہو۔

وحی کے مشہور لکھنے والوں کے علاوہ صحابۂ کرامؓ میں سے متعدد لوگ بطور خود قرآن کریم لکھتے تھے[1] اور ان کے پاس اپنا اپنا لکھا ہوا مصحف تھا کہ جس کو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سننے یا آپؐ سے حفظ کرنے کے بعد لکھا تھا۔ مثلاً مصحف حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، مصحف حضرت علی کرّم اللہ وجہہ اور مصحف حضرت عائشہ رضؓ وغیرہم[2]

حضرت عمر فاروق رضؓ کے اسلام لانے کا مشہور واقعہ کتب حدیث میں موجود ہے کہ انھوں نے اپنی بہن کے گھر میں قرآن مجید کے کچھ اوراق دیکھے تھے جن کو پڑھ کر اسلام کی صداقت ان کے دل میں بیٹھ گئی اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جاکر اسلام لائے۔ اس سے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ مکہ میں جو پڑھے لکھے مسلمان تھے وہ قرآن لکھ لیا کرتے تھے۔

---

[1] ۔ التبیان فی علوم القرآن۔

[2] حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت عثمان بن عفان رضؓ، حضرت تمیم الداریؓ، حضرت ابوالدرداءؓ، حضرت ابوایوب انصاریؓ، حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ، اور حضرت عبادہ بن الصامتؓ، حضرت زید بن ثابتؓ کے پاس بھی ان کے لکھے ہوئے مصاحف تھے۔

کتابت قرآن کا طریقہ

حضرت زید بن ثابتؓ کہ جن کا ذکر صحیح بخاری کی مذکورہ بالا روایت میں آچکا ہے، وحی لکھنے والے صحابہؓ میں ممتاز درجہ رکھتے تھے،[1] فرماتے ہیں۔

"قرآن کی جو آیتیں نازل ہوتیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجھے لکھوا دیتے، اُن کو لکھنے کے بعد میں آپؐ کو سناتا، اگر اصلاح کی ضرورت ہوتی تو آپؐ اصلاح کردیتے، پھر اس کے بعد اس لکھے ہوئے کو میں لوگوں کے سامنے لاتا۔"[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لکھنے والوں کو بتا دیا کرتے تھے کہ نازل شدہ آیت یا آیتیں فلاں سورۃ میں رکھی جائیں کہ جس میں ان باتوں کا ذکر ہے۔[3]

اس زمانہ میں لکھنے کے لئے عموماً درج ذیل چیزیں استعمال کی جاتی تھیں۔

عَسِیْبٌ۔ کھجور کی شاخ جس سے پتیاں الگ کردی گئی ہوں۔

---

[1] ذہبیؒ نے اپنے تذکرہ میں زید بن ثابتؓ کے متعلق لکھا ہے۔

کان من الراسخین فی العلم کتب الوحیَ وحفظ القراٰن واتقنہ۔

(ان کا علم پختہ تھا، کاتب وحی تھے، قرآن کے بہت اچھے حافظ تھے)

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ القرآن (رحمانی) ص ۶۶ بحوالہ مجمع الزوائد ج ۱ ص ۶۰

[3] Introduction to Islam p. 16

[3] انٹروڈکشن ٹو اسلام ص ۱۶۔ از ڈاکٹر محمد حمید اللہ

لِخَافُ. جمع ہے لَخْفَةٌ کی پتھر کی پتلی پتلی تختیاں۔

رِقَاعُ. جمع ہے رُقْعَةٌ کی، کھال یا چمڑے کے پتلے ٹکڑے، کپڑے، پتے یا کاغذ کے ٹکڑے۔

قِطَعُ الْاَدِیْم دباغت دیے ہوئے چمڑے کے ٹکڑے اَدِیْمٌ دباغت دیے ہوئے چمڑے کو کہتے ہیں جس کو چھیل کر پتلا کر لیتے اور لکھنے کے قابل بنا کر اس کے ٹکڑے کاٹ لیتے تھے۔

عِظَامُ الْاَکْتَافِ وَالْاَضْلَاع - عظام جمع ہے عَظْمٌ کی جس کے معنی ہیں ہڈی، اَکْتَافُ جمع ہے کَتِفٌ کی، خطابی[۱] نے کہا ہے کہ یہ اونٹ یا بکری کے شانہ کی چوڑی ہڈی ہوتی تھی جس پر خشک ہونے کے بعد لکھا کرتے تھے اور اَضْلَاع جمع ہے ضِلْعٌ کی، ضِلْعٌ پسلی کو کہتے ہیں،

اُلْاَقتاب۔ جمع ہے قَتَبٌ کی، اونٹ کے پالان یا کاٹھی کی لکڑی جس کو تراش کر لکھنے کے کام میں لاتے تھے۔

جو کچھ لکھا جاتا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں رکھ دیا جاتا تھا، یہاں تک کہ آپؐ کے عہد میں پورا قرآن مجید لکھ لیا گیا جو مصحف کی شکل میں نہ تھا بلکہ متفرق طور پر پتھر کی تپلی تختیوں، چمڑے کے پتلے (کاغذ نما) ٹکڑوں اور چوڑی ہڈیوں وغیرہ پر لکھا ہوا تھا۔[۲]

---

۱ مشہور فقیہ اور محدث ہیں، کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے کچھ کے نام یہ ہیں۔ ابوداؤد کی شرح معالم السنن، بیان اعجاز القرآن، غریب الحدیث، اصلاح غلط المحدثین۔ ۲ مناہل العرفان فی علوم القرآن للزرقانی ص ۲۳۹-۲۴۰

جب مُصْحَف کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ لکھے ہوئے صحیفوں (چمڑے یا کاغذ وغیرہ کے ٹکڑوں) کو دونوں طرف دفتی وغیرہ لگا کر دھاگے یا اسی قسم کی کسی چیز سے باندھ کر یا سی کر ایک جگہ کر دیا گیا ہو تاکہ وہ صحیفے منتشر نہ ہو سکیں۔

وَالصَّحِيْفَةُ قِطْعَةٌ مِنْ جِلْدٍ اَوْ قِرْطَاسٍ كُتِبَ فِيْهِ وَالْجَمع صُحُفٌ وَ صَحَائِفُ [1]

(وَالْمُصْحَفُ مُثَلَّثَةُ الْمِيْمِ) مِنْ اُصْحِفَ بِالضَّمِ أَىْ جُعِلَتْ فِيْهِ اَلصُّحُفُ الْمَكْتُوْبَةُ بَيْنَ الدَّفَّتَيْنِ وَجُمِعَتْ فِيْهِ [2]

مُصْحَفْ، مَصْحَفْ، مِصْحَفْ، میم پر پیش اور زبر اور اسکے نیچے زیر تینوں طرح سے پڑھنا صحیح ہے۔

سورتوں اور آیتوں کی ترتیب

قرآن مجید کی سورتوں میں آیتوں کی ترتیب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی الٰہی کی روشنی میں فرمائی تھی، قرآن مجید اسی ترتیب کے مطابق ہے اور اس پر علماء اسلام کا اتفاق ہے۔

زرکشیؒ نے "البرہان فی علوم القرآن" میں لکھا ہے کہ آیات کی ترتیب توقیفی [3] ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ اس

---

[1] المصباح المنیر ج ۲ ص ۳۹۴

[2] تاج العروس فصل الصاد من باب الفاء ج ۶ ص ۱۶۱

[3] توقیفی یعنی بذریعہ وحی الٰہی۔

آیت کے بعد یہ آیت ہے۔[1]

مستدرک میں حضرت زید بن ثابتؓ کی روایت میں ہے۔

كُنَّا عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نُؤَلِّفُ الْقُرْاٰنَ مِنَ الرِّقَاعِ[2]	ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مختلف ٹکڑوں سے قرآن جمع کرتے تھے۔

اس روایت میں آیتوں اور سورتوں دونوں کی ترتیب اجمالی طور پر آجاتی ہے، اس لئے کہ آیتوں کو مرتب جب ہی کہا جائے گا جب کہ ہر آیت کو اس جگہ پر رکھا گیا ہو جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو رکھنے کے لئے فرمایا، اور سورتوں کی ترتیب اسی وقت ہوسکتی ہے جب کہ آیتیں مرتب ہوں۔

زید بن ثابتؓ کی روایت میں "نُؤَلِّفُ الْقُرْاٰنَ" (ہم قرآن تالیف کرتے تھے) تالیف کہتے ہیں چند متفرق چیزوں کو اس طریقہ سے ملایا جائے کہ ان میں باہمی لگاؤ اور مناسبت پیدا ہو جائے لیکن اگر ایسا نہ ہو تو اس کو تالیف نہیں کہا جائے گا، اس سے معلوم ہوا کہ آیات ایک خاص ترتیب سے جمع کی جاتی تھیں۔

تاج العروس میں ہے۔

و اَلَّفَ بينهما تاليفاً اَوقع الالفة وجمع	تالیف کے معنی یہ ہیں کہ دو الگ الگ چیزوں کو قریب کر کے ان میں جوڑ اور

---

[1] البرہان فی علوم القرآن ص ۲۳۶ [2] المستدرک مع التلخیص (کتاب التاریخ) ج ۲ ص ۶۱۱ مطبوعہ دائرۃ المعارف، حیدرآباد ۱۳۴۰ھ

بینھما بعد تفرّق | مناسبت پیدا کردی جائے. جیسے کہ کتابوں کی
و وصلھما ومنہ تالیفُ | تالیف میں متفرق مضامین کو مناسبت
الکتب [1] | کے لحاظ سے جمع کر دیا جاتا ہے [2]

حضرت زید بن ثابتؓ کہ جن کا وحی الٰہی لکھنے والوں میں ایک خاص مرتبہ تھا اور خود بھی بہت اچھے حافظ قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج داں بھی تھے، آیتوں اور سورتوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ترتیب دیتے وقت اپنی کارگذاری سے آپؐ کو باخبر رکھتے تھے، اور جہاں ضروری ہوتا آپؐ اصلاح فرما دیتے تھے جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے۔ وحی الٰہی کی حفاظت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کس قدر محتاط تھے زید بن ثابتؓ اس سے بخوبی واقف تھے۔

حضرت زید بن ثابتؓ زیادہ تر مدینہ میں موجود رہتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو وحی لکھنے کے لئے بلاتے رہتے تھے، پھر بھی یہ ممکن ہے کہ کسی موقع پر آپؐ نے ان کو وحی لکھنے کے لئے بلایا ہو اور وہ مدینہ سے باہر ہوں اور ان کی جگہ پر آپؐ نے کسی دوسرے کاتب وحی کو بلا لیا ہو اور اُس نے نازل شدہ آیتیں لکھ لی ہوں، لیکن واپس آنے کے بعد حضرت زیدؓ کہ جن کو وحی لکھنے کی لگن تھی، آپؐ سے اور دوسرے وحی لکھنے والوں سے یہ ضرور

---

[1] تاج العروس فصل الھمزۃ من باب الفاء ج ۶ ص ۴۴
[2] یہ تاج العروس کی عبارت کا مفہوم ہے نہ کہ ترجمہ۔

پوچھتے ہوں گے کہ میرے پیچھے اور کونسی آیتیں اتری ہیں اور پوچھنے کے بعد ان کو ضرور لکھ لیتے ہوں گے، کیونکہ زید بن ثابت رض اپنے مصحف کو ہر لحاظ سے مکمل رکھنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔

روایت مذکورہ کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ حضرت زید بن ثابت رض کے ساتھ دوسرے صحابہ رض بھی آیات کی ترتیب میں شریک رہتے تھے۔

ترمذی میں حضرت عثمان رض کی یہ روایت ہے۔

قال عثمان رض کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مما یاتی علیہ الزمان وھو ینزل علیہ السور ذوات العدد فکان اذا نزل علیہ الشئ دعا بعض من کان یکتب فیقول ضعوا ھؤلاء الآیات فی السورۃ التی یذکر فیھا کذا وکذا فاذا نزلت علیہ الآیۃ فیقول ضعوا ھذہ الآیۃ فی السورۃ التی یذکر فیھا کذا وکذا [1]	حضرت عثمان رض نے فرمایا کہ بسا اوقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ساتھ مختلف سورتوں کی آیتیں نازل ہوتی تھیں جب ایسی صورت ہوتی تھی تو آپ وحی لکھنے والوں میں سے کچھ لوگوں کو بلاتے اور فرماتے کہ ان آیتوں کو اس اس سورت میں اس جگہ پر رکھو کہ جہاں ان ان باتوں کا ذکر ہے۔

اس روایت سے واضح ہو گیا کہ نزولِ قرآن کے ساتھ ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آیتوں کی ترتیب فرماتے جاتے تھے

---

[1] ترمذی ج ۲ ص ۱۳۴ ابواب التفسیر۔ (مطبوعہ رشیدیہ دہلی)

دوسری روایات[1] سے بھی یہ ثابت ہے کہ آیات کی ترتیب وحی الٰہی کے مطابق ہے۔

قاضی ابو بکر (متوفی ۴۰۳ھ) نے الانتصار میں لکھا ہے۔

"آیتوں کی ترتیب ایک امر واجب اور حکم لازم ہے اس لئے کہ جبریلؑ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو بتا دیا کرتے تھے کہ اس آیت کو فلاں جگہ رکھو[2]"

ابن الحصّار (متوفی ۶۱۱ھ) کہتے ہیں۔

سورتوں اور آیتوں کی ترتیب وحی کے ذریعہ انجام پائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیتے تھے کہ اس آیت کو فلاں جگہ رکھو اور اس (موجودہ) ترتیب کا یقین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت کے نقلِ متواتر سے اور صحابہؓ کے اسی ترتیب سے مصحف میں رکھنے پر اجماع سے حاصل ہوا ہے[3]۔

۱۔ مثلاً عثمان بن ابی العاصؓ کی یہ روایت کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اسی اثنا میں آپؐ نے نگاہ اٹھا کر دیکھا اور پھر اس کو جھکانے کے بعد فرمایا، میرے پاس جبریلؑ آئے اور مجھ کو ہدایت کی کہ میں اس آیت کو اس سورۃ میں اس جگہ پر رکھوں (آیت یہ ہے) ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ وینھیٰ عن الفحشاء والمنکر والبغی یعظکم لعلکم تذکرون سورۃ النحل آیت ۹۰ پ ۱۴

(ترجمہ از الاتقان عربی ص ۷۰)

۲۔ ایضاً ص ۷۱

۳۔ ایضاً ص ۷۱-۷۲

سورتوں کی ترتیب میں اختلاف

سورتوں کی ترتیب کے توقیفی (بذریعہ وحی الٰہی) ہونے میں علمار کا اختلاف ہے، علمار کی ایک جماعت کے نزدیک سورتوں کی ترتیب میں صحابۂ کرامؓ کے اجتہاد کو دخل ہے[۱]۔

دوسری جماعت کہتی ہے کہ آیتوں کی طرح سورتوں کی ترتیب بھی توقیفی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سورتوں کو مرتب فرما دیا تھا اور آپؐ کی وفات کے وقت پورا قرآن مجید مرتب ومنظّم حالت میں موجود تھا، لیکن چونکہ وحی کا سلسلہ آپؐ کی وفات سے کچھ عرصہ قبل تک جاری رہا اور آخر وقت تک کسی آیت یا حکم کے منسوخ ہونے کا امکان باقی تھا اس لئے آپؐ نے قرآن کی یکجا شیرازہ بندی نہیں کرائی، یہی وجہ ہے کہ قرآن عہدِ نبویؐ کے آخر تک مصحف کی شکل میں نہ تھا۔

سیوطی نے بغوی (متوفی ۵۱۶ھ) کے حوالہ سے لکھا ہے[۲]۔

"صحابہ کرامؓ نے قرآن کو جس کو اللہ نے اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا اس خیال سے کہ حفّاظ کے اُٹھ جانے سے اس کی حفاظت خطرہ میں نہ پڑ جائے، دو دفتیوں کے درمیان (کتابی شکل میں) عہدِ صدیقی میں جمع کیا، اس میں کسی قسم کی کمی یا زیادتی

---

۱ سیوطی نے اس کو جمہور علمار کا مسلک بتایا ہے۔ ملاحظہ ہو الاتقان عربی ج ۲

۲ بغوی مشہور فقیہ اور مفسّر ہیں ان کو محی السنۃ کہا جاتا ہے۔ متعدد کتابوں کے مصنّف ہیں۔

نہیں کی اور اس کو بالکل ویسا ہی لکھا کہ جیسا انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا تھا اس کی ترتیب میں بھی کسی قسم کی تقدیم و تاخیر روا نہیں رکھی۔[1]

سورتوں کی ترتیب میں اجتہاد صحابہؓ کا دخل ماننے والے اپنی دلیل میں کہتے ہیں کہ اُبی بن کعبؓ اور عبد اللہ بن مسعودؓ کے مرتّب کیے ہوئے مصاحف کی ترتیب اُس قرآن یا مصحف سے مختلف تھی کہ جس کو زید بن ثابتؓ نے تالیف یا مرتّب کیا تھا۔

یہاں اس سے بحث مقصود نہیں کہ ابی بن کعبؓ اور عبد اللہ بن مسعودؓ کے مصحف میں سورتوں کی ترتیب زید بن ثابتؓ کے نسخے سے کیوں مختلف تھی، نہ اس سے کہ ان دونوں کی ترتیب زید بن ثابتؓ کی ترتیب سے مقدّم تھی یا موخّر، نہ اس سے کہ یہ تینوں صحابہؓ اپنے اپنے مصحف کے متعلق کن خیالات کا اظہار کرتے تھے، نہ اس سے کہ سند کا درجہ زید بن ثابتؓ کے قول و عمل کو دیا جائے، کہ جن کی پوچھ کتابت وحی کے لئے دربارِ رسالت میں بہت زیادہ ہوتی تھی اور جن کو حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اور حضرت عثمان رضؓ کے دورِ خلافت میں جمع قرآن کی اہم ترین خدمت سُپرد کی گئی، یا ابی بن کعبؓ کے قول و عمل کو کہ جو بہت بڑے مرتبے کے قاری تسلیم کئے جاتے تھے، یا عبد اللہ بن مسعود رضؓ کے قول و عمل کو جو معلّم قرآن ہونے کی حیثیت

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن ص ۱۷۔ زرقانی نے مناہل العرفان میں اس کی وضاحت کی ہے۔

سے بہت مشہور اور بارگاہِ نبوّت میں مقرب تھے[۱]، اور نہ اس سے بحث ہے کہ ابی بن کعبؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ کے مصحف میں سورتوں کی ترتیب ایک دوسرے سے کس وجہ سے مختلف تھی[۲]، کیونکہ یہ ایک بہت طویل بحث ہو جائے گی، لیکن اتنا تو ثابت ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید یا مصحف اس زمانہ میں مرتّب تھا اور اس کی سورتیں خاص نظم و ترتیب سے تھیں ورنہ یہ کیسے متعیّن ہوا کہ زید بن ثابتؓ کا مصحف عبداللہ بن مسعودؓ اور ابّی بن کعبؓ دونوں کے مصحف سے سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے مختلف تھا، اور اسی طرح عبداللہ بن مسعودؓ اور ابّی بن کعبؓ کے مصحف میں سورتوں کی ترتیب ایک دوسرے سے مختلف تھی، یہاں ایک بار پھر اس طرف متوجہ کرنا بے محل نہ ہوگا کہ زید بن ثابتؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق آیات کو ترتیب

---

[۱] حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "عبداللہ بن مسعودؓ، سالمؓ مولیٰ ابی حذیفہؓ، ابّی بن کعبؓ اور معاذ بن جبل رضؓ سے قرآن پڑھنا سیکھو۔"

[۲] سیوطی نے الاتقان میں ابن اشتہ (متوفی ۳۶۰ھ) کی "کتاب المصاحف" سے ابی بن کعبؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ کے مصحف میں سورتوں کی جو ترتیب نقل کی ہے وہ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ تفصیل کے لئے الاتقان، اٹھارویں نوع کا آخر ملاحظہ ہو۔ مولانا جیراجپوری اختلاف مصاحف کے بارے میں لکھتے ہیں "بعض روایتیں مصحف عبداللہ بن مسعودؓ و ابی بن کعبؓ کی سورتوں کی ترتیب کو موجودہ قرآن سے کسی قدر مختلف ظاہر کرتی ہیں، لیکن وہ اس قدر (باقی حاشیہ ص ۶۹ پر)

دیتے جس میں دیگر صحابہؓ بھی شریک رہتے تھے۔

ڈاکٹر صبحی الصالح " مباحث فی علوم القرآن" میں لکھتے ہیں۔

" ان صحابہؓ نے ذاتی یا شخصی طور پر اس ترتیب کو اختیار کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عثمان رضؓ کی خلافت کے زمانہ میں جب پوری امّت ایک مصحف پر متفق ہو گئی تو ان لوگوں نے اپنے ترتیب دیے ہوئے مصحف کو چھوڑ کر اسی کو تسلیم کر لیا[۱]۔"

" تاریخ القرآن" میں مستند احادیث کے حوالوں کے بعد قرآن مجید کی سورتوں اور آیتوں کی ترتیب کے متعلق درج ذیل عبارت سے مزید وضاحت ہو جائے گی۔

" الغرض بانی اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سورتوں کی آیات میں اور سورتوں میں جو ترتیب قائم کی اور ہزاروں صحابہؓ نے آپؐ سے جس ترتیب سے سنا اور آپؐ نے پڑھایا لکھایا اسی ترتیب سے صحابہؓ نے یاد کیا اور لکھا، اور ان کے بعد تابعینؒ نے بھی صحابہؓ سے جو ترتیب سُنی یا لکھی وہ وہی ترتیب تھی جو بانی اسلامؐ کے مبارک عہد میں قائم ہو چکی تھی اور نسلاً بعد نسلٍ اُسی طرح سے اس وقت تک محفوظ ہے[۲]۔"

(بقیہ حاشیہ ص ۶۸) ضعیف ہیں کہ کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہیں (تاریخ القرآن ص۴۱ مولانا اسلم جیراجپوری) ص ۶۸ حاشیہ نمبر ۱ میں ابن اُشتۃ کا جو ذکر آیا ہے یہ محمد بن عبداللہ بن اشتہ ابوبکر الاصبہانی ہیں اور فنِ قرارت کے ماہر ہیں "محبّر" اور "مفید" "قرارات شاذۃ" میں ان ہی کی کتابیں ہیں۔

[۱] مباحث فی علوم القرآن ص ۷۱

[۲] تاریخ القرآن۔ مفتی عبداللطیف رحمانی۔ ص ۹۸

بخاری میں سورۃ البقرہ کے فضائل میں ابو مسعودؓ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص "سورۃ البقرۃ" کی آخری دو آیتیں رات کو پڑھ لیا کرے تو یہ اس کے لئے کافی ہیں[1]۔

ایک اور روایت حضرت ابوہریرہؓ سے ہے۔

"اپنے بستر پر جایا کرو تو آیت الکرسی پڑھ لیا کرو، (اس سے) تم برابر اللہ کی حفاظت میں رہو گے اور صبح تک شیطان تمھارے قریب نہ آسکے گا[2]"۔

ان روایتوں میں "سورۃ البقرہ" کی آخری دو آیتوں اور آیۃ الکرسی پڑھنے کے لئے فرمایا گیا جو سورۃ البقرہ کے ختم ہونے سے کچھ پہلے ہے، جس سے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ پوری سورۃ مرتب تھی۔

آیات اور سورتوں کی ترتیب کے متعلق علامہ عبد العلی بحر العلوم متوفی ۱۲۲۵ھ کی تحقیق

اہل سنت والجماعۃ کا اس پر اجماع ہے کہ ہر سورۃ کی آیتوں کی ترتیب توقیفی ہے جو اللہ اور رسولؐ کے حکم سے دی گئی ہے اور کسی قسم کے شک و شبہ کے بغیر یہ ترتیب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے اب تک متواتر چلی آرہی ہے، الاتقان میں ہے کہ بہت سے علماء

---

[1] بخاری ج ۲ ص ۷۴۹ ۔ مسلم ج ۱ ص ۲۷۱ (کتاب فضائل قرآن وما یتعلق بہ)

[2] ایضاً۔

نے کہ جن میں سے زرکشی اور ابو جعفر بن الزبیر (متوفی ۷۰۸ھ) ہیں کہا ہے کہ اس پر علماء کا اجماع ہے۔[1]

رہی سورتوں کی ترتیب تو اس کے متعلق علماء محققین کہتے ہیں کہ ان کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ترتیب دیا گیا ہے اور (یہ بھی) کہا گیا ہے کہ سورتوں کی یہ ترتیب صحابہ رضی کے اجتہاد سے ہے۔ جس کی دلیل ہیں ابن فارس[2] (متوفی ۳۹۵ھ) نے کہا ہے کہ حضرت علی رضی کا مصحف[3] ترتیب نزولی[4] کے مطابق تھا، اور مصحف عبداللہ بن مسعود[5] رضی کی ترتیب حضرت علی رضی کے مصحف اور اب جو مصحف (قرآن) ہے دونوں سے

---

[1] ترجمہ از "فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت" ص ۱۱ - ۱۲، طبع امیریہ بولاق مصر ۱۳۲۴ھ، ابو جعفر بن الزبیر کی ایک کتاب قرآن مجید کی سورتوں کی ترتیب پر بھی ہے، اس کا نام البرھان فی ترتیب سُوَرِ القرآن ہے۔

[2] ھو احمد بن فارس بن زکریا ابو الحسین الرازی القزوینی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، جامع التاویل فی تفسیر القرآن اور المجمل ان ہی کی کتابیں ہیں۔

[3] ابن الندیم کتاب الفہرست میں لکھتے ہیں کہ میں نے ابو یعلی حمزۃ الحسنی کے پاس ایک قرآن دیکھا تھا جو ان کے خاندان میں متوارث چلا آتا تھا اور حضرت علی رضی کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا (مقالات شبلی، مذہبی جلد اول ص ۱۱)

[4] یعنی جس ترتیب سے قرآن نازل ہوا، اسی ترتیب سے لکھا ہوا۔

[5] علامہ شبلی رحمہ لکھتے ہیں:- "ابن الندیم نے لکھا ہے کہ میں نے عبداللہ بن مسعود رضی کے متعدد قرآن دیکھے، لیکن ان میں دو بھی باہم متفق نہ تھے (مقالات شبلی حصہ اول (مذہبی) بحوالہ کتاب الفہرست ص ۲۶)

مختلف تھی، لیکن پہلی بات (سورتوں کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ترتیب دیا جانا) صحیح ہے اور یہ روایات (ابن فارس وغیرہ کی) خیالی اور خلافِ حقیقت ہیں، جو مستند کتابوں میں نہیں ہیں، ایسی کمزور روایات اس تواتر اور توارث کے مقابلہ میں کہ جو (نسلاً بعد نسلٍ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے اب تک چلا آرہا ہے قابلِ اعتبار نہیں ہیں[1]۔

مفسرین نے ایک آیت کی دوسری آیت اور ایک سورت کی دوسری سورت سے مناسبت اور ربط کے سلسلہ میں بہت کچھ لکھا ہے، ایک آیت کا دوسری آیت سے اور ایک سورت کا دوسری سورت سے ربط و تعلق بیان کیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آیتوں اور سورتوں میں ترتیب ہے ورنہ مناسبت اور ربط کا کیا مفہوم ہوگا۔

سورتوں کی ترتیب کے سلسلے میں بخاری کی یہ روایت اہمیت رکھتی ہے۔

عن فاطمۃؓ قالت اسرّ الی النبیّ صلی اللہ علیہ وسلّم انّ جبرئیل یعارضنی بالقرآن کلّ سنۃ مرّۃً	حضرت فاطمہ زہراؓ فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے رازدارانہ طور پر فرمایا کہ جبرئیلؑ ہر سال مجھ سے ایک مرتبہ قرآن سنتے اور سناتے (دور کرتے) تھے اور اس سال دو مرتبہ

---

[1] فواتح الرحموت ص ۱۱-۱۲

وانہ عارضنی العام مرّتین — مجھ سے دور کیا، اس سے مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ

ولا اراہ الّا حضور اجلی[1] — میری موت (کا وقت) قریب ہے۔

قرآن مجید جس قدر نازل ہوتا جاتا تھا حضرت جبرئیلؑ ہر سال آپؐ کے ساتھ اس کا دور کرتے، جس میں باری باری سے ایک دوسرے کو سناتا ہے، حضرت جبریلؑ نے آپؐ کے سالِ وفات میں دو مرتبہ دور کیا، روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کچھ ہی پہلے کا ہے جب کہ تقریباً پورا قرآن نازل ہو چکا تھا اور مرتّب تھا اس لئے کہ دَور میں روانی سے سنانا ہوتا ہے، قرآن میں ایک سو چودہ سورتیں ہیں ان کا سنانا اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ تمام سورتیں مرتّب ہوں اور سنانے والے کو بھی ترتیب سے یاد ہوں، اور دونوں مرتبہ دونوں نے ایک دوسرے کو ایک ہی ترتیب سے سنایا ہو ورنہ ان کو دو دَور نہیں کہا جا سکتا۔

بخاری نے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے یہ روایت کی ہے۔

"محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ سورۃ بنی اسرائیل الکہف، مریم، طٰہٰ اور الانبیاء میرا خزانہ ہیں۔[2]"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں

---

[1] بخاری ج ۲ باب کان جبریل یعرض القرآن علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بخاری کتاب ابواب فضائل القرآن ج ۲ ص ۷۴۷ - ۷۴۸

[2] بخاری عن ابن مسعودؓ ج ۲ ص ۷۴۷

سورتیں مرتب تھیں اور بعینہٖ یہی ترتیب قرآن کی سورتوں کی اب بھی ہے۔

مسلم میں سورۃ الکہف کے فضائل میں[1] ہے۔

حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے سورۃ الکہف کی ابتدائی دس آیتیں یاد کرلیں وہ دجال کے فتنہ سے محفوظ رہے گا۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ سورۃ الکہف بھی مرتب تھی۔

ابوجعفر النحاس[2] (متوفی ۳۳۸ھ) کے نزدیک پسندیدہ قول یہ ہے کہ سورتوں کی یہ ترتیب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی ہے جو اس وقت سے اب تک چلی آرہی ہے، جیسا کہ واثلۃ بن الاسقع کی حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اُعْطِیْتُ مکان التوراۃ السبع الطُوَّل" (توراۃ کی بجائے مجھ کو سات بڑی سورتیں دی گئی ہیں)۔

پوری روایت یہ ہے۔

عن واثلۃ بن الاسقع	واثلۃ الاسقع روایت کرتے ہیں کہ
عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم	مجھ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

---

[1] مسلم ج ۱ ص ۲۷۱ باب فضائل القرآن وما یتعلق بہ (فضائل سورۃ الکہف)

[2] ترجمہ از الاتقان عربی ص ۶۲، اٹھارویں نوع کا آخر (ابوجعفر النحاس کا نام احمد بن محمد بن اسماعیل المرادی المصری ہے، یہ مفسر اور ادیب ہیں "تفسیر القرآن" "اعراب القرآن"، "ناسخ القرآن ومنسوخہ" کے مصنف ہیں۔

قال اعطیتُ السبع الطُّوَل مکان التوراۃِ واعطیت المئین مکان الانجیل واعطیتُ المثانی مکان الزّبور وفُضِّلتُ بالمفصَّلِ [1]	مجھے، توراۃ کے بدلے سات بڑی سورتیں دی گئیں ہیں اور انجیل کے عوض مئین اور زبور کی بجائے مثانی، اور فضیلت کے طور پر (ان سب کے علاوہ) مجھ کو مفصّل دی گئی ہیں۔

"حاکم، نسائی اور دوسرے لوگوں نے ابن عباس رضؓ سے روایت کی ہے۔ انھوں نے کہا سات بڑی سورتیں البقرہ[1]، آل عمران[2]، النساء[3]، المائدہ[4]، الانعام[5] اور الاعراف[6] ہیں۔ راوی نے کہا کہ ابن عباس رضؓ نے ساتویں کا بھی نام لیا تھا وہ میں بھول گیا۔[2]

یہ چھ سورتیں قرآن میں اسی ترتیب سے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے قرآن کو سورتوں کے اعتبار سے چار حصوں میں تقسیم کر دیا تھا جس سے قرآن کا عہد نبوی میں مرتب ہو جانا ظاہر ہو جاتا ہے۔

السَّبعُ الطُّوَل[1]، مئین[2]، مثانی[3]، مفصّل[4]۔

السَّبعُ الطُّوَل (سات بڑی سورتیں) ان کو طوّل بڑی یا لمبی ہونے کی وجہ سے کہا گیا ہے۔ طُوَل جمع ہے طُولیٰ کی جیسے کہ کُبَرٌ جمع ہے

---

[1] یہ روایت متعدد طرق سے مروی ہے، مسند احمد بن حنبل میں حضرت واثلہ رضؓ سے جو روایت ہے اس میں السبعُ کے بعد الطُّوَل نہیں ہے۔ زبور کی بجائے مئین اور انجیل کی بجائے مثانی کے دیے جانے کا ذکر ہے۔ مسند احمد بن حنبل ج ۴ ص ۱۰۷، مطبوعہ قاہرہ

[2] ترجمہ از الاتقان فی علوم القرآن عربی ص ۶۳

کبریٰ کی ہے[1]

مئین ۔ جن سورتوں میں کچھ کم و بیش سو آیتیں ہیں۔

مثانی ۔ یہ مئین کے بعد کی سورتیں ہیں اور ان میں آیتوں کی تعداد مئین سے کم ہے۔

مفصّل ۔ چھوٹی سورتیں کہ جن کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے بیچ میں بسم اللہ کے بار بار لکھنے کی وجہ سے فصل ہو جاتا ہے (ایک سورۃ دوسری سے الگ ہو جاتی ہے) یہ مثانی کے بعد ہیں اور سورت قٓ سے شروع ہو کر سورۃ النّاس پر ختم ہو جاتی ہیں جن کو حزب مفصّل بھی کہا جاتا ہے۔

جلال الدین سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ سات بڑی سورتوں میں پہلی سورۃ البقرہ ہے اور آخری سورۃ البرارۃ ہے، سیوطیؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ علمار کی ایک جماعت یہی کہتی ہے، لیکن سورۃ البقرۃ سے سورۃ البرارۃ تک سورتوں کی تعداد آٹھ ہو جاتی ہے[2] نہ کہ سات، روایات سے ثابت ہے کہ سورۃ الانفال اور سورۃ البرارۃ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں دو الگ الگ سورتیں دونوں نام سے شمار کی جاتی تھیں، سورۃ البرارۃ بعد میں نازل ہوئی ہے اور سورۃ الانفال پہلے، اگر برارۃ سورۃ الانفال کا جزء ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو سورۃ الانفال میں لکھواتے، سورتوں کی ترتیب میں بھی آپؐ نے سورۃ البرارۃ کو سورۃ الانفال کے بعد رکھا تھا

---

[1] البرہان فی علوم القرآن للزرکشی (چودھویں نوع)

[2] ان علمار کے نزدیک تعداد سات ہوگی جو دونوں کے درمیان بسم اللہ نہ ہونے کی وجہ سے ایک سورت تسلیم کی گئی ہے۔

سورۃ البراءۃ کے شروع میں آپؐ نے بسم اللہ نہیں لکھوائی، ظاہر ہے کہ آپؐ نے ایسا وحی الہٰی کے مطابق کیا، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب کوئی سورۃ نازل ہوتی تو بسم اللہ بھی نازل ہوتی تھی، اس سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ سورۃ البراءۃ کے ساتھ بسم اللہ کا نزول نہیں ہوا[1]، جس کی صحیح حکمت اور وجہ نازل کرنے والا ہی جانتا ہے، لیکن اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ البراءۃ کو ایک مستقل سورۃ شمار کیا۔

قشیری (متوفی ۴۶۵ھ[2]) کہتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ جس وقت یہ سورۃ نازل ہوئی تو جبریلؑ اس کو بسم اللہ کے بغیر لائے تھے۔

احادیث سے ثابت ہے کہ تلاوت میں سہولت کے خیال سے صحابہ کرامؓ کا حزب مقرر تھا جس کے مطابق وہ روزانہ قرآن کی تلاوت کرتے اور ایک ہفتہ میں پورا قرآن ختم کر لیتے تھے، پہلے روز تین سورتیں (البقرۃ، آل عمران اور النساء) دوسرے روز پانچ سورتیں سورۃ المائدہ سے سورۃ البراءۃ تک (المائدہ، الانعام، الاعراف، الانفال اور سورۃ البراءۃ کہ جس کو سورۃ التوبہ بھی کہا

---

[1] البرہان فی علوم القرآن للزرکشی ج ۱ ص ۲۶۳ - اس سورۃ کے شروع میں بسم اللہ نہ لکھے جانے کی وجہ بیان کرتے ہوئے زرکشی نے البرہان میں متعدد اقوال لکھے ہیں۔

[2] عبدالکریم بن ہوازن بن عبدالملک بن طلحہ ابوالقاسم النیسابوری القشیری م ۴۶۵ھ - ان کی کتابوں میں سے ایک مشہور کتاب "التیسیر فی التفسیر" ہے

کہا جاتا ہے) المائدۃ سے البراءۃ تک پانچ سورتیں جب ہی ہوں گی جب کہ سورۃ الانفال اور سورۃ البراءۃ دو الگ الگ سورتیں شمار کی جائیں، تیسرے روز سات سورتیں (سورۃ یونس سے سورۃ النحل تک) چوتھے روز نو سورتیں (سورۃ بنی اسرائیل سے سورۃ الفرقان تک) پانچویں روز گیارہ سورتیں (سورۃ الشعراء سے سورۃ یٰسٓ تک) چھٹے روز تیرہ سورتیں (الصّٰفّٰت سے سورۃ الحجرات تک) ساتویں روز تمام مفصّل (سورۃ قٓ سے ختم قرآن تک)

قرآن کی حزبوں میں تقسیم

ثقیف کا جو وفد مدینہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اُس میں اَوس بن حذیفہ ثقفی رض بھی تھے، وہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کے بعد ہم لوگوں کے پاس تشریف لاکر باتیں کرتے تھے، ایک رات آپؐ دیر سے تشریف لائے میں نے عرض کیا کہ آج رات آپؐ کو دیر کیسے ہوگئی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن کا جتنا حصّہ میں تلاوت کرتا تھا اس کا مجھ کو ایک دم خیال آیا میں نے چاہا کہ اس کو پورا کرنے کے بعد میں باہر نکلوں، اوس بن حذیفہ رض کہتے ہیں کہ (صبح ہونے پر) میں نے صحابہ رضؓ سے پوچھا کہ تم لوگ تلاوت کے لئے قرآن کے حصّے[1] (وِرد)

---

[1] حدیث میں ہے "کیف تحزّبون القرآن" الحِزْبُ۔ الوِرْدُ یعتادہ الشخص من صلاۃ وقراءۃ والحزبُ النصیب۔ (المصباح المنیر ج ۱ ص ۱۶۱)

کیسے کرتے ہو، انھوں نے کہا پہلے دن تین سورتیں پھر پانچ سورتیں اس کے بعد سات سورتیں، پھر نو سورتیں اس کے بعد گیارہ سورتیں پھر تیرہ سورتیں اس کے بعد حزب مفصّل (یعنی) سورہ قٓ سے قرآن کے ختم تک۔[1]

زرکشی برہان میں لکھتے ہیں کہ حساب لگایا جائے تو (چھ دن کی) اڑتالیس ۴۸ سورتیں ہوتی ہیں جن کے بعد سورہ[2] قٓ ہے (جو ساتویں دن کا حزب مفصّل ہے اور اسی پر قرآن ختم ہو جاتا ہے)

اوس بن حذیفہ رض کی روایت سے واضح ہو گیا کہ پورا قرآن عہدِ رسالتؐ میں مرتّب تھا جس کو تلاوت میں آسانی کے خیال سے صحابہ کرامؓ سات حزبوں میں تقسیم کر کے پڑھتے تھے۔

"سات منزلوں پر تقسیم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے۔[3]

لغت میں حزبٌ کے معنیٰ انسانوں کے گروہ کے ہیں۔ نماز و قراءۃ وغیرہ کی اس مقدار کو بھی حزب یا وِرد کہا جاتا ہے کہ جس کو پابندی سے پڑھنے کا کوئی شخص عادی ہو جائے۔ حزبٌ حصہ کو بھی کہتے ہیں۔

اوس بن حذیفہ رض کی روایت سے علاّمہ ابن حجر (متوفی ۸۵۲ھ)

---

[1] البرہان فی علوم القرآن ص ۲۴۷ - اوس بن حذیفہ ثقفی رض کی یہ روایت سنن ابی داؤد ج ۱ ص ۱۹۸ (کتاب الصلوٰۃ باب تحزیب القرآن میں ہے) مطبع مجیدی کانپور، مطبوعہ ۱۹۵۵ء اور مسند امام احمد بن حنبل ج ۴ ص ۳۴۳ مطبوع قاہرہ میں بھی ہے (باب تحزیب القرآن)

[2] البرہان فی علوم القرآن ص ۲۴۷

[3] تاریخ القرآن ۔ از قاضی عبدالصمد صارم ص ۱۰۳

نے استدلال کیا ہے کہ سورتوں کی ترتیب توقیفی ہے[۱]۔

حفاظت قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اہتمام

سطور بالا میں گذر چکا ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی میں پورا قرآن ترتیب سے لکھ لیا تھا، قرآن مجید کی آیتیں صاف طور سے بتاتی ہیں کہ وحی الٰہی کو محفوظ کر لینے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کس قدر بے چین رہتے تھے، ان کو مع تفسیر گذشتہ صفحات میں لکھا جا چکا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اچھی طرح جانتے تھے کہ قرآن کی حفاظت کا جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا لیکن اس کے باوجود آپؐ نے اس کی حفاظت کی ظاہری تدابیر اختیار کرنے میں کمی نہیں کی، آپؐ نے جن لوگوں کو جہالت کی تاریکی سے نکالا تھا نہ صرف ان کے لیے بلکہ قیامت تک آنے والی نسلوں کے لیے آپؐ کو ایک مستقل راہ اور لائحہ عمل چھوڑنا تھا کیونکہ آپؐ پر آخری نبی و رسولؐ ہونے کی وجہ سے ذمہ داریوں کا بوجھ بہت بڑھ گیا تھا۔

یہودیوں اور عیسائیوں نے توریت و انجیل میں جو تحریف و تبدیلی کی تھی اس سے آپؐ بخوبی واقف تھے، آپؐ نے بار بار ان لوگوں سے فرمایا کہ تمہارا یہ طریقہ گمراہی کو بڑھانے والا اور اللہ سے دور

۱؎ ترجمہ از الاتقان فی علوم القرآن عربی ص ۶۳

پیدا کرنے والا ہے جس کے مقرب ہونے کا تم زبانی دعویٰ کرتے ہو تم اس سے باز آجاؤ، لیکن وہ آپؐ کی باتوں کی طرف توجہ نہ کرتے اور غیر مناسب رویّہ اختیار کرتے تھے۔

حفاظت قرآن کے بارے میں مشہور شیعی علماء کے دلائل

علامہ طبرسی چھٹی صدی ہجری کے مشہور شیعی مفسّر نے اپنی تفسیر "مجمع البیان فی تفسیر القرآن" کے مقدمہ میں حفاظت قرآن کے بارے میں جو لکھا ہے اس کا خلاصہ نیچے لکھا جاتا ہے۔

یہ کہنا کہ قرآن مجید میں کچھ بڑھا دیا گیا ہے سب کے نزدیک باطل ہے، رہی کمی کرنے کی بات تو اس کی روایت ہماری جماعت کے کچھ لوگوں نے اور حشویہ نے کی ہے کہ قرآن میں تغیّر اور کمی ہوئی ہے، لیکن ہمارے فرقہ کا صحیح مذہب یہ ہے کہ قرآن میں کسی قسم کی کمی اور تغیر نہیں ہوا ہے اور علاّمہ سید مرتضیٰ قدس سرّہٗ نے بھی مفصّل بحث میں اسی کی تائید کی ہے۔ انھوں نے کئی جگہ لکھا ہے کہ قرآن کے صحیح حالت میں اب تک باقی رہنے کا علم ایسا ہی ہے جیسا کہ شہروں کا علم اور بڑے بڑے واقعات اور مشہور کتابوں اور عرب کے مدوّن اشعار کا علم، حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن کو صحت کے ساتھ ایک دوسرے تک پہنچانے اور اس کی حفاظت کے اسباب ان چیزوں سے بہت زیادہ تھے

کہ جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کیوں کہ قرآن مجید نبوّت کا معجزہ شرعی اور دینی احکام کا سرچشمہ ہے اور علمار اسلام اس کی حفاظت و حمایت میں بہت زیادہ کوشش کرتے رہے ہیں. یہاں تک کہ قرآن کے اعراب، اس کی قرارت، اس کے حروف و آیات کے اختلاف تک انھوں نے محفوظ رکھے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اتنی سخت احتیاط و توجہ کے ہوتے ہوئے اس میں کچھ ردّو بدل یا کمی کردی گئی ہو، علاّمہ سید مرتضیٰ نے یہ بھی کہا ہے کہ قرآن مجید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اسی طرح سے لکھا ہوا اور مرتّب تھا جیسا کہ اب ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن پڑھتے اور اس کو زبانی یاد کرتے اور آپؐ کو سناتے تھے، متعدد صحابہؓ مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابیّ بن کعبؓ اور دوسرے صحابہ رضؓ نے کئی بار آپؐ کے سامنے قرآن ختم کیا تھا اور جن گروہوں نے اسکے خلاف بات کہی ہے وہ قابلِ اعتبار نہیں ہے، انھوں نے کمزور روایات کو اپنے خیال میں صحیح سمجھ کر دلیل کے طور پر پیش کیا ہے[1]۔

شیخ الطائفہ ابوجعفر محمد بن الحسن الطوسی اپنی مشہور تفسیر

---

[1] مجمع البیان فی تفسیر القرآن (عربی) ص ۱۵ للشیخ ابی الفضل بن الحسن الطبرسی من اکابر العلمار ملامیتہ فی القرآن السادس مطبوعہ ۱۹۷۳ء۔ چاپخانہ اسلامیہ طہران۔

"التبیان فی تفسیر القرآن" میں لکھتے ہیں۔

قرآن مجید میں کمی اور زیادتی کی بات کرنا قطعاً مناسب نہیں ہے، علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اُس میں کچھ بھی بڑھایا نہیں گیا ہے، اسی طرح علماء یہ بھی کہتے ہیں کہ اس میں کچھ کمی نہیں کی گئی ہے، ہمارے نزدیک بھی صحیح بات یہی ہے ایسا ہی علامہ سید مرتضیٰ نے بھی کہا ہے، اور اسی کی تائید روایات سے ہوتی ہے، بعض خاص و عام لوگوں کا یہ کہنا کہ قرآن کی بہت سی آیتیں کم کر دی گئی ہیں اور ایک جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ لکھدی گئی ہیں، کچھ وزن نہیں رکھتا، یہ روایات احاد ہیں کہ جن پر نہ اعتماد کیا جا سکتا ہے اور نہ عمل، ان سے تو دور رہنا بہتر ہے اور اگر ان میں کچھ وزن مان لیا جائے تب بھی موجودہ قرآن مجید کہ جس کی صحت امت کے نزدیک مسلّم ہے اس پر کوئی حرف نہیں آتا۔[1]

اہلِ کتاب اور مشرکین کی مسلسل یہی کوشش رہی کہ کسی نہ کسی طرح قرآن کی طرف سے لوگوں کو شک و شبہ میں مبتلا کر دیا جائے وہ دیکھ رہے تھے کہ اس کا نزول جس قدر زیادہ ہوتا جا رہا ہے اُسی قدر لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہوتے جا رہے ہیں اور ہم لوگوں کا سماجی اور سیاسی اقتدار کمزور ہوتا چلا جا رہا ہے، وہ مختلف طریقوں سے آپؐ کے اصلاحی اور تبلیغی کاموں

---

[1] ترجمہ از "التبیان فی تفسیر القرآن" (عربی) الشیخ الطائفہ ابی جعفر محمد بن الحسن الطوسی متوفی ۴۶۰ھ الجزء الاول ص ۳ المطبعۃ العلمیۃ فی النجف ۱۳۷۶ھ (العراق)

میں رکاوٹ پیدا کرنے کی فکر اور کوشش میں لگے رہتے اور اس کے لئے ہر طرح طرح کی تدبیریں کرتے تھے، ان حالات میں آپؐ قرآن مجید کو جو کہ اللہ کی آخری کتاب ہے ایسی حالت میں کیسے چھوڑ سکتے تھے کہ جس کی وجہ سے لوگوں کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا کہ آپؐ نے قرآن تو لکھا ہوا چھوڑا ہے لیکن وہ ایسی حالت میں نہیں ہے کہ جس کے بہت عرصہ تک باقی اور محفوظ رہنے کی توقع کی جا سکے، اور یہ خطرہ مسلسل آپؐ کے پیشِ نظر رہا۔

قرآن پڑھنے اور پڑھانے میں صحابہؓ کی احتیاط

نزولِ قرآن کی ابتداء سے اس کے انتہائی مراحل تک آپؐ بہت غور سے دیکھ رہے تھے کہ کس کس طرح سے صحابہؓ اس کو محفوظ کرنے کی تدابیر کر رہے ہیں اور اسکے یاد کرنے اور لکھنے میں کتنی احتیاط سے کام لے رہے ہیں، جس لفظ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھینچ کر پڑھتے[1] یا جہاں آپؐ وقف کرتے تو وہ بھی اس کو بالکل اسی طرح ادا کرتے اور اس کو یہاں تک تفصیل سے یاد کرتے کہ کس جگہ آپؐ نے وقف سانس توڑ کر کیا، اور کہاں بغیر سانس توڑے، اور دوسروں کو بھی بتاتے کہ آپؐ نے اس لفظ یا اس حرف کو اس طریقہ سے ادا کیا ہے تاکہ وہ بھی اُسی طریقہ سے پڑھیں اور پڑھائیں

---

[1] قال قتادة سالت انس بن مالکؓ عن قراءة النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال کان یمدّ مدًّا۔ بخاری باب مدّ القراءة ج ۲

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضؓ ایک شخص کو قرارۃ سکھا رہے تھے اس نے "إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ" پڑھتے وقت لفظ فقرار کو ارسال کے ساتھ پڑھا (یعنی فقرار کو کھینچ کر نہیں پڑھا) حضرت ابن مسعود رضؓ نے یہ سن کر کہا کہ یہ مقام آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایسے نہیں پڑھایا، اس نے کہا اچھا تو پھر کیسے ؟، حضرت ابن مسعود رضؓ نے جواب دیا کہ آپؐ نے مجھے اسکی قرارت "إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ" سکھائی ہے، لہٰذا تم بھی الفقرار کو مد کے ساتھ یعنی کھینچکر پڑھو، علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے الانقان میں اس روایت کو قابلِ حجّت کہا ہے۔

جب قرآن مجید کے پڑھنے اور پڑھانے میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ نے اس قدر اہتمام سے کام لیا کہ اس سلسلے میں چھوٹی سے چھوٹی باتوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ قرآن کی سورتوں کو ایسی حالت میں چھوڑ دیتے کہ جس کی وجہ سے آپؐ کے بعد اختلافات پیدا ہو جانے کا اندیشہ باقی رہتا۔

مذکورہ بالا احادیث، دلائل عقلیہ اور اہلِ لغت و علوم القرآن کے ماہرین کے اقوال کے پیشِ نظر اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے کہ قرآن مجید کی سورتوں کی ترتیب محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے اور آیتوں کی طرح سورتوں کی ترتیب بھی توقیفی ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانۂ خلافت میں دوسری بار قرآن کا جمع

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت ایک دو نہیں بلکہ متعدد صحابہ کرامؓ کے پاس مکمل و مرتب قرآن مصحف کی شکل میں تھا جیسا کہ مذکورہ بالا صفحات میں ذکر کیا گیا، اس کے علاوہ بہت سے لوگ ایسے بھی تھے کہ جن کے پاس متفرق و منتشر نوشتے تھے جن کی شیرازہ بندی نہیں کی گئی تھی اور وہ مصحف کی شکل میں نہ تھے۔

آفتاب رسالتؐ غروب ہوجانے کے بعد جب حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ ہوئے تو ان کو بہت سی مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا، مسیلمہ کذاب اور اس کے ساتھیوں سے ۱۱ھ میں جنگ یمامہ ہوئی جس میں حافظوں اور قاریوں کی ایک بڑی تعداد شہید ہوگئی جس کے بارے میں مورخین کے اقوال مختلف ہیں، یہ دیکھ کر حضرت عمر فاروقؓ کو یہ خیال ہوا کہ اگر مستقبل میں بھی ایسا ہوتا رہا تو حفاظت قرآن کو خطرہ ہوسکتا ہے[۱]۔ ان کا یہ خیال محض دور اندیشی کی بنا پر تھا۔ انھوں نے اپنے اس خیال کو حضرت ابوبکر صدیق رضؓ سے ظاہر کرتے ہوئے یہ تجویز کیا کہ آپ قرآن کو جمع کرائیے۔ یہاں یہ شبہ ہوتا ہے

---

[۱] تفصیل کے لیے روایت زید بن ثابتؓ، بخاری باب جمع القرآن ج ۲ ص ۷۴۵

کہ جب متعدد صحابہؓ کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا لکھا ہوا مصحف موجود تھا تو پھر ایسی صورت میں حضرت عمرؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے کیا چاہتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت عمرؓ پوری طرح باخبر تھے کہ صحابہؓ میں سے کس کس کے پاس لکھا ہوا قرآن مصحف کی شکل میں موجود ہے اور اس سے بھی بے خبر نہ تھے کہ بہت سے صحابہؓ کے پاس مختلف چیزوں پر لکھا ہوا قرآن منتشر اور متفرق طور پر ہے، حضرت زید بن ثابتؓ کے نسخے کے بارہ میں بھی وہ جانتے تھے کہ وحی الٰہی کے خاص کاتب ہونے کی حیثیت سے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں انھوں نے کس اہتمام و احتیاط سے اس کو لکھا تھا۔ وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ جن لوگوں نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن لکھا تھا ابھی ان میں سے کچھ لوگ موجود ہیں۔

ان تمام باتوں کے پیش نظر حضرت عمرؓ خلیفہء وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ کو قرآن کے جمع (لکھوانے) کا مشورہ دے کر اپنی یہ خواہش ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ قرآن مجید حکومت کی نگرانی میں لکھوا کر اور جلد بندھوا کر اس کو مصحف کی شکل دیدی جائے۔ حضرت عمرؓ کی یہ تجویز غالباً اس لئے تھی کہ اس مصحف کو حکومت کا تصدیق شدہ مصحف سمجھ کر وہ لوگ بھی اس کو تسلیم کرلیں گے کہ جن کے پاس اپنا اپنا لکھا ہوا مصحف ہے، اور آیندہ کسی قسم کے اختلاف کا امکان باقی نہیں رہے گا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو یہ مشورہ نہیں دیا کہ حضرت زید بن ثابتؓ یا حضرت ابی بن کعبؓ

کے مصحف کی حکومت تصدیق کر دے کیونکہ جن دیگر صحابہ کرامؓ کے پاس اُن کے لکھے ہوئے مصاحف تھے ان کا احترام بھی ملحوظ تھا۔

پہلے تو حضرت ابوبکرؓ سوچ میں پڑ گئے کہ جس کام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا اس کو وہ کیسے کریں،

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ طرح طرح کے فتنے سر اٹھا رہے تھے۔ ممکن ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس خیال سے کہ کہیں کوئی اور فتنہ نہ اٹھ کھڑا ہو اس وقت حضرت عمرؓ کا مشورہ قبول نہ کیا ہو لیکن حضرت عمرؓ اپنی بات پر اصرار کرتے رہے اور آخر کار حضرت ابوبکرؓ نے ان کی رائے سے اتفاق کر لیا[1]۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے حضرت زید بن ثابتؓ کو بلایا۔ حضرت عمرؓ وہاں پہلے سے موجود تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جب ان سے اپنا خیال ظاہر کیا تو زید بن ثابتؓ نے کہا کہ آپؐ وہ کام کیوں کرتے ہیں کہ جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ حضرت ابوبکرؓ ان کے شبہات دور کرتے اور مصالح سمجھاتے رہے یہاں تک کہ ان کی سمجھ میں بھی

---

[1] ڈاکٹر صبحی الصالح نے لکھا ہے کہ جنگ یمامہ کے بعد ۱۲ھ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قرآن جمع کرایا اور اس کام میں تقریباً ایک سال کا عرصہ لگ گیا اور یہ کام حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات سے پہلے مکمل ہو گیا۔ مباحث فی علوم القرآن ص ۷۷

بات آگئی، حضرت ابوبکرؓ نے ان سے کہا کہ تم تحقیق و تفتیش سے قرآن جمع کرو۔ حضرت زید بن ثابتؓ ہر طرح سے اس اہم کام کے اہل تھے، لیکن اس کے باوجود ان کو یہ کام ایک پہاڑ کو اپنی جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھنے سے زیادہ مشکل نظر آ رہا تھا، جہاں بھی جن جن لوگوں کے پاس اور جس جس چیز پر بھی قرآن لکھا ہوا تھا ان سے، اور قرآن کے حافظوں یا قرار سے زید بن ثابتؓ اور ان کے ساتھ کام کرنے والوں نے لوگوں کے سامنے ہر ایک کے لکھے ہوئے کا دوسرے کے لکھے ہوئے سے مقابلہ اس لئے کیا کہ حکومت کی طرف سے پہلی بار مصحف تیار کرنے کے لئے جو کچھ کیا جا رہا تھا اس میں سب شریک و باخبر رہیں اور کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ میرا لکھا ہوا تو سامنے رکھا ہی نہیں گیا، اور اس لئے بھی کہ جو کچھ اس میں لکھا جائے اس میں کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے، حکومت کے ذمہ دار، زید بن ثابتؓ اور ان کے رفقار کار دیکھ رہے تھے کہ کچھ منافقین اور فتنے پیدا کرنے والے ابھی موجود ہیں اس لئے بہت سوچ سمجھ کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

زید بن ثابت انصاریؓ کہتے ہیں کہ سورۃ البراءۃ کی آخری آیتیں مجھے ابو خزیمہؓ انصاری کے سوا کسی اور کے پاس نہیں ملیں، زید بن ثابتؓ کا مطلب یہ تھا کہ یہ آیتیں یاد تو بہت سے لوگوں کو تھیں لیکن اس وقت کی تحقیق و تفتیش میں صرف ابو خزیمہؓ کے پاس لکھی ہوئی ملیں[1]۔

---

[1] تفصیل کے لئے، مقالات شبلی ج ۱ ص ۹ امرجبی (زید بن ثابتؓ کی یہ روایت بخاری باب جمع القرآن ج ۲ ص ۷۴۵ - ۷۴۶ میں ہے۔

زید بن ثابتؓ کے قول کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں نے پورا قرآن جمع کیا (لکھا) تھا ان کے پاس تو مجھے سورۃ التوبہ (سورۃ البرارۃ) کی آخری آیتیں مل ہی گئی تھیں۔ لیکن جن لوگوں نے پورا جمع نہیں کیا تھا ان میں سے صرف ابو خزیمہؓ[1] کے پاس ملیں[2]۔

زرقانی لکھتے ہیں:

ای لم یجد مکتوبۃ الا مع ابی خزیمۃ الانصاریؓ مع ان زیدا کان یحفظھا وکان کثیر من الصحابۃؓ یحفظونھا ولکنہ اراد ان یجمع بین الحفظ والکتابۃ زیادۃ فی التوثق و مبالغۃ فی الاحتیاط[3]	یعنی زید بن ثابتؓ کو یہ آیتیں لکھی ہوئی صرف ابو خزیمہؓ انصاری کے پاس ملیں حالاں کہ زید بن ثابتؓ اور بہت سے صحابہؓ کو وہ زبانی یاد تھیں لیکن زید بن ثابتؓ احتیاط و استحکام کے خیال سے یہ چاہتے تھے کہ وہ آیتیں کہیں لکھی ہوئی مل جائیں اور ان کو حفاظ سے بھی سن لیں۔

طریق کار

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ

---

[1] البرہان فی علوم القرآن ص ۲۳۹

[2] ہو سکتا ہے کہ ابو خزیمہؓ ان لوگوں میں سے ہوں کہ جنھوں نے قرآن متفرق طور پر لکھا ہو لیکن دوسرے متفرق طور پر لکھنے والوں کی نسبت سے ان کے پاس زیادہ لکھا ہوا ہو۔ [3] مناہل العرفان فی علوم القرآن ص ۲۴۵

سے کہا کہ تم دونوں مسجد کے دروازے پر بیٹھ جاؤ، جو شخص تمھارے پاس کتاب اللہ کا کوئی حصہ مع دو گواہوں کے لائے اس کو لکھ لو۔

ابن حجرؒ م ۸۵۲ھ کہتے ہیں کہ دو گواہوں سے مراد یہ ہے کہ قرآن (کا وہ حصہ) اس شخص کو زبانی یاد ہو اور اس کے پاس لکھا ہوا ہو[۱]۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے سورۃ التوبہ (سورۃ البرأۃ) کی آخری آیتوں کو اس وقت لکھا جب انھوں نے حافظوں سے سن لیا اور ابو خزیمہؓ کے پاس لکھا ہوا بھی دیکھ کر خود کو مطمئن کر لیا۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ کی یہ دور اندیشی تھی کہ اس نازک مرحلہ پر زید بن ثابتؓ کی رہنمائی کی اور بتادیا کہ اس ڈھنگ سے کام کریں۔

سیوطیؒ نے سخاوی (متوفی ۶۴۳ھ) کے حوالہ سے دو گواہوں کے لانے کا یہ مطلب لکھا ہے کہ دو گواہ یہ گواہی دیں کہ وہ لکھا ہوا (قرآن[۲]) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھا گیا ہے[۳]۔

اس طریقہ سے حضرت ابو بکر صدیقؓ نے زید بن ثابتؓ اور

---

[۱] مباحث فی علوم القرآن للشیخ مناع القطان ص ۸۵

[۲] ایک آیت یا اس سے زیادہ آیتوں پر بھی قرآن کا اطلاق ہوتا ہے۔

[۳] ترجمہ از الاتقان ص ۶۷۔ سخاوی کا نام علی بن محمد بن عبدالصمد ہے۔ ابوالحسن ان کی کنیت ہے، شافعی المذہب، متعدد علوم و فنون کے ماہر اور بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔

ان کے ساتھیوں سے قرآن جمع کرایا۔

"حضرت ابوبکر صدیق رض پہلے شخص ہیں کہ جنھوں نے قرآن مصحف (کی شکل) میں جمع کیا۔"[۱]

اوپر گذر چکا ہے کہ حکومت کی نگرانی میں سب سے پہلے حضرت صدیق رض نے جمع کیا۔ علامہ زرکشیؒ نے بھی لکھا ہے کہ لوگوں میں جو یہ مشہور ہے کہ جامع قرآن حضرت عثمان رض ہیں صحیح نہیں ہے، سب سے پہلے پورا قرآن جمع کرنے والے حضرت ابوبکر صدیق رض ہیں[۲]۔

مصحف کی حفاظت

یہ مصحف حفاظت کے خیال سے حضرت ابوبکر رض نے اپنے پاس رکھا، ان کے بعد حضرت عمر رض کے پاس رہا، اور ان کی وفات کے بعد ام المومنین حضرت حفصہ رض کے پاس رہا۔

فكانت الصحف عند ابى بكر حتى توفاه الله ثم عند عمر حياته ثم عند حفصة بنت عمر۔[۳]	یہ صحیفے حضرت ابوبکر رض کے پاس ان کی وفات تک رہے، پھر حضرت عمر رض کے پاس اور ان کے بعد ان کی صاحبزادی حضرت حفصہ رض (ام المومنین) حضرت عمر رض کی صاحبزادی کے پاس رہے۔

۱؎ مباحث فی علوم القرآن للشیخ مناع القطان۔ ص ۵۲

۲؎ البرہان فی علوم القرآن ج ۱ ص ۲۳۹

۳؎ بخاری ج ۲ باب فضائل القرآن باب جمع القرآن ص ۷۴۵ - ۷۴۶

سیوطی رح لکھتے ہیں۔

ابن ابی[1] داؤد نے کتاب المصاحف میں عبد خیر سے بہ روایت سند حسن سے کی ہے "میں نے علی رض کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ مصاحف کے بارے میں سب سے زیادہ اجر ابو بکر رض کو ملے گا خدا ابو بکر رض پر رحمت نازل کرے وہ پہلے شخص ہیں کہ جنھوں نے کتاب اللہ کو جمع کیا"[2]۔

مصحف کس چیز پر لکھا گیا

اس قدر محنت و کاوش سے اللہ کی جو کتاب لکھی جا رہی تھی ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں جو بہتر سے بہتر چیز لکھنے کے لیے دستیاب ہو سکتی تھی اُسی پر لکھا گیا ہو گا، مصر کے ایک مشہور عالم شیخ عبدالوہاب حمودہ نے اپنے ایک مقالہ "کتابۃ القرآن" میں لکھا ہے۔

"چمڑے کو دباغت دے کر پتلا کر لیا جاتا تھا جس کو "رَق" کہا جاتا ہے۔ عربوں میں "رَق" پر بھی لکھنے کا رواج تھا، صحابہ رض اس پر متفق ہو گئے تھے کہ قرآن کو اس پر لکھا جائے کیونکہ وہ پتلا اور پائیدار ہوتا ہے"[3]۔

---

[1] ھو عبداللہ بن سلیمان بن الاشعث الازدی السجستانی، ابو بکر بن ابی داؤد ۔ علم الحدیث کے بڑے حفاظ میں سے ہیں اور بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔

[2] ترجمۂ از الاتقان فی علوم القرآن (عربی) ص ۶۰

[3] مجلۃ لواء الاسلام ستمبر ۱۹۴۷ء ص ۲۷ (مقالہ شیخ عبدالوہاب حمودہ)

اُس زمانہ میں لکھنے کے لئے جو دوسری چیزیں استعمال کی جاتی تھیں اُن کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔

حضرت عثمانؓ کی خلافت کے زمانہ میں

تیسری بار قرآن کا جمع

عرب کے قبائل کی زبانوں میں لب ولہجہ، اعراب اور الفاظ کے ادا کرنے میں اختلاف تھا، مثلاً ایک قبیلہ حَتّٰی کو عَتّٰی کہتا تو دوسرا شروع میں آنے والی ہمزہ کو ع (عین) بولتا اور اُسلُمُ کو عَسلُمُ کہتا کسی قبیلہ کے لوگ مضارع کی علامت کے فتحہ (زبر) کو کسرہ (زیر) سے پڑھتے اور بولتے، کوئی ع (عین) کو نون (ن) سے بدل دیتا اور اَعطِیٰ کو اَنطیٰ بولتا، یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے دوسری زبانوں میں بھی اس قسم کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک ہی صوبہ کے لوگ جو بظاہر ایک ہی زبان بولتے ہیں ان کے لب و لہجہ اور الفاظ کے ادا کرنے کے طریقوں میں کبھی کبھی اس قدر فرق ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کی بات کا سمجھنا دشوار ہوجاتا ہے، ظاہر ہے کہ ایسا لب ولہجہ کے الگ الگ ہونے، زبان کے بعض الفاظ کے ادا کرنے پر قادر نہ ہونے وغیرہ کی وجہ سے ہوتا ہے۔

عرب کا ہر قبیلہ اپنے لب ولہجہ پر مجبور تھا، بولنے والے اپنے ہی قبیلہ کے لب ولہجہ کے مطابق الفاظ ادا کرسکتے تھے، اس کا اثر

قرآن مجید کے پڑھنے پر بھی ہوا۔

جہاں قرآن کے مفہوم و معانی پر اثر نہیں پڑتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تلفظ، طریقِ ادا اور کہیں کہیں اعراب کے اختلاف کے باوجود ایک خاص حد تک وحی الٰہی کے پیشِ نظر اس کو جائز رکھا اور یہی اجازت قراءتِ سبعہ (سات قراءتوں) کی بنیاد قرار پائی۔[1]

شیخ ابوالحسن اشعری م ۳۲۴ھ لکھتے ہیں۔

"مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ قرآن پڑھنے میں وسعت پیدا کرنے کے لئے جن قراءتوں کو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے ان کو ممنوع قرار دینا درست نہ ہوگا اور امت کے لئے جائز نہیں ہے کہ جن قراءتوں کے جائز ہونے پر اللہ تعالیٰ نے کوئی پابندی نہیں لگائی ہے ان سے روکے۔ یہ قراءتیں اب بھی منتشر طریقہ پر قرآن میں موجود ہیں۔"[2]

علامہ نوویؒ نے قراءتِ سبعہ کے متعلق قاضی ابوبکر الباقلانی کی رائے درج ذیل الفاظ میں ظاہر کی ہے۔

"اس میں شک نہیں کہ یہ سات قراءتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے چلی آرہی ہیں جن کو پوری احتیاط سے محفوظ رکھا گیا

---

[1] تفصیل کے لئے مقالات شبلی حصہ اول (مذہبی) ص ۱۷۔ تاریخ القرآن ابو عبداللہ زنجانی ص ۶۵، تاریخ القرآن مولانا جیراجپوری۔

[2] عمدۃ القاری ج ۶ ص ۲۶

ہے، ان کو حضرت عثمانؓ اور ایک جماعت نے مصحف میں برقرار رکھا اور لوگوں کو بتایا کہ یہ صحیح ہیں، ان میں جو متواتر نہ تھیں ان کو نہیں لیا گیا۔ ان قراءتوں میں کبھی معانی کا اختلاف ہوتا ہے اور کبھی الفاظ کا بھی، لیکن ان میں باہمی تضاد اور مخالفت نہیں ہوتی[1]"

خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضؓ کے عہد میں اسلام دور دراز ممالک تک پھیل چکا تھا، عراق، مصر، شام و ایران وغیرہ بہت سے ملکوں کے اکثر لوگ اس دولت سے سرفراز ہو چکے تھے، حضرت عمرؓ کے بعد جب حضرت عثمان رضؓ کی خلافت کا زمانہ آیا تو اسلامی فتوحات کا دائرہ اور بڑھ گیا، نئی نئی قومیں اسلام میں داخل ہونے لگیں، صحابۂ کرام مفتوحہ ملکوں میں پہونچ چکے تھے، تابعین کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھ رہی تھی، لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے دور ہوتے جا رہے تھے۔

اسلام قبول کرنے والوں میں وہ لوگ بھی تھے کہ جو لوگ عربی زبان نہیں جانتے تھے، جن کی زبان عربی تھی انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس اجازت کی کہ جس میں آپؐ نے اختلاف لب ولہجہ کی وجہ سے اختلاف اعراب و تلفظ وغیرہ کے ساتھ قراءت قرآن کو جائز رکھا تھا، صحیح روح کو نظر انداز کر دیا اور مقررہ حدود سے آگے بڑھ گئے، قبائل کی زبانیں بہت مختلف اور وسیع

---

[1] نووی شرح المسلم ج ۱ ص ۲۷۲

تھیں جن کا سمجھنا دوسروں کے لئے آسان نہ تھا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن پڑھنے کے ڈھنگ، اعراب اور تلفظ وغیرہ میں اختلافات بڑھتے چلے گئے، شامی کہتے کہ ہم تو اُبیؓ بن کعبؓ کی قرارت پڑھتے ہیں، کوفی دعوی کرتے کہ ہم نے عبداللہ بن مسعودؓ کی قرارت کو اختیار کیا ہے، ان کے علاوہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی طرف منسوب قرارت کے پڑھنے والے بھی تھے، جن کی قرارت اور حروف کے ادا کرنے میں ایسا اختلاف تھا کہ جس کے لئے اُن کے پاس کوئی سند صحیح نہ تھی۔ ان سب باتوں کا اثر قرارت سیکھنے والے شاگردوں پر پڑتا جس کی وجہ سے پڑھانے والے آپس میں جھگڑنے لگتے اور ایک دوسرے کو کافر تک کہنے کی نوبت آجاتی[1]

جس رفتار سے نئے نئے ملکوں پر مسلمانوں کا قبضہ ہو رہا تھا اسی رفتار سے یہ اختلافات بڑھتے چلے جارہے تھے، اور عجمی لوگ تو قرارت میں کھلی غلطیاں کرتے۔ اکثر اپنی قرارت کی سند بتائے بغیر اس کو صحیح اور دوسروں کی قرارت کو غلط قرار دیتے جس کی وجہ سے کبھی کبھی صورت حال بہت سنگین ہو جاتی، یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ لوگوں نے اپنے قبیلہ کی زبان اور لب ولہجہ وغیرہ کے لحاظ سے قرآن لکھ بھی لئے ہوں اور ان میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہو۔

---

[1] تفصیل کے لئے "مناہل العرفان" ص ۲۴۸ - ۲۴۹

حضرت[1] حذیفہ بن الیمانؓ جلیل القدر صحابی کہ جو اہل عراق کے ساتھ آرمینیہ اور آذربائیجان کی جنگ میں شریک تھے، انھوں نے جب عراقیوں کو قرآن پڑھتے سنا اور ان کی قراءت کے اختلاف کو دیکھا تو بہت گھبرائے، مدینہ آکر حضرت عثمانؓ سے شکایت کی اور کہا کہ مسلمانوں کی جلد خبر لیجئے، ایسا نہ ہو کہ جس طرح یہود و نصاریٰ نے اپنی کتابوں میں اختلاف پیدا کر دیئے ہیں مسلمان بھی ویسا کرنے لگیں انھوں نے حضرت عثمانؓ کو پوری طرح سے وہاں کے حالات سے باخبر کر دیا۔

حضرت عثمانؓ نے بہت جلد موقع کی نزاکت کو سمجھ لیا، مہاجرینؓ انصارؓ میں سے چند ممتاز صحابہ کو بلاکر مشورہ کیا، جس میں یہ طے پایا گیا کہ مصحف صدیقی کی نقلیں کرانے کے بعد مرکزی مقامات میں بھیجدی جائیں اور لوگ صرف ان ہی کے مطابق پڑھیں، اس تدبیر سے لوگوں کے پیدا کئے ہوئے اختلافات ختم ہو جائیں گے، حضرت عثمان رضؓ نے اس کو عملی جامہ پہنانے کی ابتداء ۲۵ھ میں کی اور یہ علامہ ابن حجرؒ کا قول ہے[2]۔

حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس امانت کے طور پر

---

[1] تفصیل کے لئے حدیث انس بن مالک بخاری ج ۲ ص ۷۴۶، باب جمع القرآن۔

[2] الاتقان فی علوم القرآن ص ۱۶۹ اٹھارویں نوع۔ علامہ ابن حجرؒ نے کہا ہے کہ جو لوگ اس کو ۳۰ھ کا واقعہ بتاتے ہیں ان کے پاس اس کی کوئی سند نہیں ہے اور ان کا یہ قول سہو ہے۔

جو مصحف رکھوایا گیا تھا اس کو منگواکر زید بن ثابتؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، سعید بن العاصؓ اور عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام کو مقرر کیا کہ اس کی نقل کریں[1]۔ اس کی قیادت حضرت زید بن ثابتؓ کے سپرد کی گئی۔

زید بن ثابتؓ کے سوا تینوں قریشی تھے۔ اُن سے کہا کہ جب تم میں اور زید بن ثابتؓ میں قرآن کے کسی حصہ میں اختلاف ہو تو اس کو قُریش کی زبان کے مطابق لکھنا، کیوں کہ قرآن ان ہی کی زبان میں اتارا گیا ہے۔ اس ارشاد سے حضرت عثمانؓ ان لوگوں کو اس طرف متوجہ کرنا چاہتے تھے کہ اگر قرآنِ کریم کی کتابت کے دوران رسم الخط کے طریقہ میں کوئی اختلاف ہو تو قریش کے رسم الخط کو اختیار کیا جائے، پورے قرآنِ کریم میں صرف ایک جگہ اختلاف ہوا، قریشی صحابہؓ نے کہا کہ تابوت (بڑی تا) لکھا جائے اور حضرت زید بن ثابتؓ نے کہا کہ تابوۃ (گول تا سے) لکھا جائے، جب یہ معاملہ حضرت عثمانؓ کے سامنے پیش ہوا تو انھوں نے فرمایا کہ التابوت (بڑی تا سے) لکھو کیونکہ قرآن قریش کی زبان میں نازل ہوا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ اور قریشی صحابہؓ کے درمیان جن اختلافات کا ذکر فرمایا وہ رسم الخط کا اختلاف تھا۔

---

[1] ابن ابی داؤد کی روایت میں ہے کہ حضرت عثمانؓ نے قریش اور انصار میں سے اس کام کے لئے لوگ مقرر کئے۔ (الاتقان ص ۶۹ اٹھارھویں نوع)

وَلمّا اختلفوا فی التابوت فقال زید بن ثابت رض التابوۃ وقال اُولٰئک الثلاثۃ التّابوتُ وامرھُم عثمان رض ان یکتبوہ بلسان قریش التّابوت[1]

اور جب ان لوگوں میں تابوت کے لکھنے میں اختلاف ہوا تو زید بن ثابت رض نے کہا کہ التابوۃ (گول تا سے) لکھا جائے اور تینوں قریشی حضرات نے کہا کہ التابوت (بڑی تا سے) لکھا جائے اور حضرت عثمان رض نے حکم دیا کہ وہ قریش کی زبان میں التابوت لکھیں۔

جب ان لوگوں نے متعدد نقلیں تیار کر لیں تو حضرت عثمان رض نے وہ مصحف حضرت حفصہ رض کو واپس کر دیا[2]۔

حضرت عثمان رض نے حکم دے دیا کہ اس مصحف کے سوا پہلے کے جس قدر صحیفے یا مصحف ہوں ان کو سوخت کر دیا جائے[3]، جلانے کا حکم دینے سے پہلے حضرت عثمان رض نے صحابہ رض سے مشورہ کیا اور ان لوگوں نے حضرت عثمان رض کی رائے سے اتفاق کیا[4]۔

اس وقت تک اعراب اور نقطوں کا رواج نہیں ہوا تھا، اس لئے یہ مصاحف اعراب اور نقطوں سے خالی تھے۔

سیوطی رح نے لکھا ہے۔

حضرت عثمان رض نے جو مصاحف مختلف جگہوں میں بھیجے تھے

---

[1] عمدۃ القاری ج ۷ ص ۴۹۲

[2] الاتقان ص ۱۴۹ و (حدیث انس بن مالک بخاری ج ۲ ص ۷۴۶، باب جمع القرآن)

[3] ایضاً [4] مباحث فی علوم القرآن ص ۸۶ ڈاکٹر صبحی الصالح

ان کی تعداد میں اختلاف ہے، مشہور یہ ہے کہ وہ پانچ تھے۔
ابن ابی داؤد کہتے ہیں کہ میں نے ابو حاتم السجستانی (متوفی ۲۴۸ھ) کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ سات مصاحف لکھے گئے، جن میں سے ایک تو مدینہ میں محفوظ رکھا گیا اور ایک ایک مکہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ اور کوفہ بھیجدیا گیا۔[1]

"مناھل العرفان" میں ہے کہ نقل کرکے پہلے ایک مصحف تیار کیا گیا اور پھر اس کی نقلیں اسلامی صوبوں میں بھیجدی گئیں۔[2]

جن صحابہؓ کے پاس اپنا لکھا ہوا مصحف تھا انھوں نے بھی اس کو تسلیم کر لیا، جیسا کہ گزشتہ سطور میں ذکر کیا گیا صرف حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پہلے تو آمادہ نہیں ہوئے، لیکن پھر انھوں نے بھی کچھ سوچنے اور غور کرنے کے بعد اس کو تسلیم کر لیا۔[3]

حضرت عثمانؓ کا کارنامہ

حضرت عثمانؓ کا یہ ایک بڑا کارنامہ ہے کہ جب قرآن کے پڑھنے میں عرب قبائل، شامیوں، عراقیوں اور عجمیوں میں اختلاف کی وجہ سے ایک بڑے فتنہ کا دروازہ کھلنے والا تھا تو انھوں نے مہاجرین وانصار کے ساتھ متفق الرائے ہو کر عہد صدیقی کے

---

[1] الاتقان عربی ص ۶۰
[2] "مناھل العرفان فی علوم القرآن" للزرقانی ص ۲۵۵
[3] ایضاً ص ۲۵۴

مصحف کی نقلیں دور دراز علاقوں میں بھیج کر اس کو بند کر دیا اور یہی اس جمع کی بڑی خصوصیت ہے۔

اختلاف لغات اور لب ولہجہ کی وجہ سے قرآن کے پڑھنے میں جو اختلافات پیدا ہوا تھا حضرت عثمان رضؓ نے جس قدر ممکن تھا اپنی اس تدبیر سے اس کو مٹا دیا جیسا کہ سطور بالا میں ذکر کیا گیا، لیکن جن مختلف قراتوں کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی الٰہی کے پیش نظر اجازت دی تھی، ان کے مطابق پڑھنے سے حضرت عثمان رضؓ کیوں روکتے۔ وہ قرارات تو آج بھی مستند کتابوں میں موجود ہیں اور فن تجوید کے ماہران کو پڑھتے اور پڑھاتے رہے ہیں۔ تیسری بار جمع قرآن کے متعلق علامہ عبدالعلی بحر العلوم متوفی ۱۲۲۵ھ نے لکھا ہے کہ اس مرتبہ قرآن اس غرض سے لکھا گیا کہ قراء صحیح قرارات سے واقف ہو جائیں اور اس میں غلطی نہ کریں۔[1]

آیۃ اور سورۃ کے معنی

آیۃ کا لغت میں کئی معنی میں استعمال ہوتا ہے ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

آیۃ کے معنی معجزہ، آیۃ کے معنی علامت، آیۃ کے معنی عبرۃ، آیۃ کے معنی عجیب چیز، اور آیۃ دلیل کے معنیٰ میں بھی آتا ہے اور ان

---

[1] فواتح الرحموت، شرح مسلم الثبوت ص ۱۳

سب معانی میں یہ لفظ قرآن میں استعمال ہوا ہے، آیۃ کی جمع آیات ہے۔

اصطلاح میں آیۃ قرآن کی سورتوں کے ان چھوٹے اور بڑے حصوں یا ٹکڑوں کو کہا جاتا ہے کہ جو ایک دوسرے سے مناسبت رکھتے ہیں۔

آیۃ کے لغوی اور اصطلاحی معنیٰ میں مناسبت پائی جاتی ہے، قرآن کی آیات معجزہ اس لئے ہیں کہ کوئی ایسا کلام پیش نہیں کر سکتا، یہ آیتیں اس ذاتِ گرامی کی سچائی کی علامت یا نشانی ہیں کہ جس پر قرآن مجید نازل ہوا ہے اور یہ ان لوگوں کے لئے عبرت ہیں کہ جو ان میں بتائی ہوئی باتوں سے عبرت حاصل کرنا چاہتے ہوں۔ اور یہ عجیب اس لئے ہیں کہ ان کو سننے کے بعد بہت سے سننے والوں کو یہ کہنا پڑا کہ یہ کلام عجیب ہے کہ کسی انسان کا کلام معلوم نہیں ہوتا اور وہ اس پر ایمان لے آئے، اور آیات دلیل اس لئے ہیں کہ ان میں دلیل کے طور پر اللہ کی قدرت، حکمت اور اس کے رسولؐ کی صداقت کا بار بار ذکر کیا گیا ہے۔

سورۃ[1] کے لغوی معنی منزلۃ یعنی رتبہ یا مرتبہ کے ہیں، کہا

---

[1] (ومن المجاز السُّورة بالضم (المنزلة) (والسورة من القرآن) ای معروفة (لانها منزلة بعد منزلة مقطوعة عن الاُخرىٰ وفی المحكم، سمّیت السورة من القرآن سورة لانها درجة الی غیرها وقیل سمیت سورة القرآن تشبیهاً (ربانی ص ۱۰۲ ج ۱)

جاتا ہے ھو رفیع منزلۃ (وہ اونچا رتبہ یا مرتبہ رکھتا ہے)۔

سورۃ کے معنی علامت کے بھی ہیں، اونچی اور اچھی عمارت کے لیئے بھی سورۃ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ سورۃ کی جمع ہے سُوَر اور اصطلاح میں قرآن کی آیتوں کے ایک مستقل مجموعہ کو کہتے ہیں کہ جس کا شروع اور ختم ہوتا ہے اور ہر سورۃ میں الفاظ و معانی کے اعتبار سے خوبی اور رفعت ہوتی ہے۔ سُوْر المدینہ اس دیوار کو کہا جاتا ہے۔ کہ جو شہر کی حفاظت کے لیئے بنائی جاتی ہے۔ اور اس کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوتی ہے اسی مناسبت کے پیش نظر قرآن کی سورۃ کو سورۃ کہا جاتا ہے کہ وہ ان آیتوں کو گھیرے ہوئے ہوتی ہے کہ جو اس میں ہوتی ہیں یا ان احکام وغیرہ کو کہ جو اس میں بیان کیئے جاتے ہیں یا بتائے جاتے ہیں۔

قرآن مجید میں کُل ایک سو چودہ (۱۱۴) سورتیں ہیں۔

نقطے اور اعراب

مصحف عثمانی میں نقطے اور اعراب نہیں تھے، اسی لیئے جاننے والوں سے سیکھنے کے بعد لوگ اس میں متعدّد قراءات پڑھ سکتے تھے، ان کو نقطوں اور اعراب کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی،

(باقی ص ۱۰۳) بسور المدینۃ لانھا محیطۃٌ بآیات واحکام احاطۃ السُّور بالمدینۃ (تاج العروس فصل السین من باب الراء ج ۳ ص ۲۸۳)

حضرت عثمان رض کی وفات کے بعد کافی عرصہ تک لوگ مصحف عثمانی میں قرآن کی تلاوت کرتے رہے، لیکن پھر قرآن کے الفاظ ادا کرنے میں غلطیاں کرنے لگے، خصوصاً عراق کے لوگ کہ جو عجمیوں سے زیادہ گھل مِل گئے تھے اور ان کی زبان پر عجمی رنگ چڑھنے لگا تھا۔

عبدالملک بن مروان کے زمانہ خلافت ۶۵-۸۶ھ میں حکومت کے بعض ذمّہ دار لوگوں نے یہ خیال کیا کہ اگر قرآن پر اعراب اور نقطے نہیں لگائے گئے تو غلط پڑھنے والوں کی تعداد بڑھتی رہے گی جس کی وجہ سے مستقبل میں زیادہ دشواریاں پیدا ہوسکتی ہیں، عبیداللہ بن زیاد متوفی ۶۷ھ اور حجاج بن یوسف متوفی ۹۵ھ نے اس طرف خاص توجہ کی کہ جو خود بھی بڑا ادیب وقاری تھا۔

علماء میں ایک عرصہ سے اس بارہ میں اختلاف رہا ہے کہ قرآن پر سب سے پہلے نقطے اور اعراب کس نے لگائے۔ اس سلسلے میں تین شخصوں کے نام لیے جاتے ہیں۔ ابوالاسود الدولی، متوفی ۶۹ھ یحییٰ بن معمر متوفی ۱۲۹ھ اور نصر بن عاصم اللیثی متوفی ۸۹ھ، لیکن زیادہ مشہور یہی ہے کہ سب سے پہلے ابوالاسود الدؤلی نے قرآن پر اعراب اور نقطے لگائے، جب کہ انھوں نے ایک شخص کو دیکھا

لہ یہ غلطیاں شدید اور اس نوعیت کی نہ تھیں کہ جن کی بنا پر حضرت عثمان رض نے مصحف عثمانی لکھوایا۔

کہ وہ ایک آیت کے پڑھنے میں ایسی غلطی کر رہا ہے کہ جس کی وجہ سے مطلب بالکل بدل جاتا ہے اور اُن پر اس کا بہت اثر ہوا، اس سے پہلے بصرہ کا حاکم ایک بار ان سے کہہ چکا تھا کہ وہ قرآن پر حرکات لگائیں، لیکن کسی وجہ سے وہ تعمیل نہ کر سکے، اس واقعہ نے تازیانہ کا کام دیا اور ابوالاسود نے اعراب کی ابتداء اس طرح سے کی زبر کی علامت حرف کے اوپر ایک نقطہ، زیر کی علامت حرف کے نیچے ایک نقطہ، پیش کی علامت حرف کے سامنے ایک نقطہ، اور سکون کی علامت کے لئے حرف پر دو نقطے لگائے۔[1]

زرکشیؒ نے مبرّد سے نقل کیا ہے کہ مصحف پر سب سے پہلے نقطے ابوالاسود الدؤلی نے لگائے۔[2]

زرکشی لکھتے ہیں کہ جاحظ نے کتاب "الامصار" میں لکھا ہے کہ نصر بن عاصم اللّیثی م ۸۹ھ نے مصحف پر سب سے پہلے نقطے لگائے۔[3]

بعض علماء نے لکھا ہے کہ ابوالاسود نے قرآن پر نقطے اور اعراب عبدالملک بن مروان کے کہنے سے لگائے۔[4]

---

[1] تفصیل کے لئے مباحث فی علوم القرآن، ڈاکٹر صبحی ص ۹۱-۹۲

[2] البرھان فی علوم القرآن ج ۱ ص ۲۵۰ (یہ وہی ابوالاسود الدؤلی ہیں کہ جنھوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حکم سے عربی زبان کے قواعد بنائے)

[3] ایضاً ص ۲۹۱

[4] مباحث فی علوم القرآن ص ۹۲

اسلم جیراجپوری لکھتے ہیں۔

" صدر اوّل میں نقطے بھی نہیں لگائے جاتے تھے، نہ اعراب دئے جاتے تھے، اور امّت کا تواترِ قرارات کافی سمجھا جاتا تھا، جب حدود اسلام زیادہ وسیع ہو گئے تو مزید احتیاط کے لئے حجاج بن یوسف نے نصر بن عاصم کاتب سے اس قسم کے مصاحف لکھوائے جن میں نقطوں اور حرکتوں کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہو اور اس وقت سے پابندی ہونے لگی[1]۔

ابوالاسود نے کسی کے کہنے سے اعراب اور نقطے لگانے کی ابتدار کی ہو یا خود ہی کسی کے کہے اور حکم دیئے بغیر اس اہم کام کی ابتدار کی، لیکن یہ بات بہرحال قابلِ تسلیم نہیں کہ صرف ابوالاسود نے نقطے اور حرکات لگانے کا کام انجام دیا[2]۔ یہ کام

---

[1] تاریخ القرآن، محمد اسلم جیراجپوری۔

[2] اگرچہ یہ مشہور یہی ہے کہ عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں نقطے ایجاد کئے گئے لیکن تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے تحریر میں نقاط استعمال ہوتے تھے، عبدالملک کی خلافت سے پہلے کی ایسی قدیم تحریریں ملی ہیں کہ جن میں بعض حروف پر نقطے لگے ہوئے تھے جیسے کہ با اور تا یا اسی قسم کے حروف، کیونکہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ حروف ایک دوسرے سے اس قدر ملتے جلتے ہوں اور ان کو ایک دوسرے سے ممتاز کرنے کے لئے نقطے نہ لگائے جاتے ہوں، اس لئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسلام سے قبل نقطوں کا رواج تھا (باقی ص ۱۰۸ پر)

اتنا آسان نہ تھا کہ جس کو ایک ہی شخص پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتا. ابوالاسود کے ساتھ ان کے دونوں شاگرد یحییٰ بن یعمر اور نصر[۱] بن عاصم اللیثی اس اہم کام میں شریک تھے۔

خلیل بن احمد متوفی ۱۷۵ھ نے ہمزہ (ء) تشدید (ّ) اجزم (ْ) اور مد کے لئے ایک خط (~) ایجاد کیا[۲]۔

اجزائے قرآن، بعض علامات اور رسم الخط

قرآن سورتوں میں منقسم ہے، یہ تقسیم اللہ کی طرف سے ہے اور ہر سورت ایک مستقل باب یا فصل ہے، سات حزبوں میں تقسیم پڑھنے میں آسانی کی غرض سے صحابہؓ نے عہد رسالت میں کی جیسا کہ گزشتہ صفحات میں اوس بن حذیفہ رضؓ ثقفیؓ کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے۔

جہاں ٹھہرنا چاہیئے اور جہاں ملا کر پڑھنا چاہیئے، یہ سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے ہے لیکن زبانی تعلیم تھی، تحریر میں کوئی نشان نہ تھا، صحابہ رضؓ کے عہد میں آیت کی علامت (:)

(بقیہ ص ۱۰۷) اور کسی وجہ سے وہ رواج رفتہ رفتہ بہت ہی کم ہوگیا یا ختم سا ہوگیا" (تاریخ القرآن از ابو عبداللہ زنجانی ص ۸۹)

[۱] نصر بن عاصم اللیثی یحییٰ بن یعمر کے بھی شاگرد ہیں۔

[۲] تاریخ القرآن از مولانا عبدالصمد صارم ص ۱۰۸

تین نقطے قرار پائے یہ آیت کے سروں پر لگائے جاتے تھے[1]

ابوالاسود الدؤلی نے آیت کا نشان گول دائرہ (O) مقرر کیا[2]۔

تحریر میں رکوع کا یہ (ع) نشان علماء کی ایجاد ہے۔ یہ نشان امام ابوعبداللہ محمد بن محمد طیفور السجاوندی متوفی ۵۶۰ھ کی ایجاد ہے[3]۔

قرآن مجید میں پانچسو اٹھاون (۵۵۸) رکوع ہیں۔

مصحف عثمانی میں الگ الگ اجزاء نہ تھے، قرآن کی تیس اجزاء (تیس پاروں) میں تقسیم بعد میں ہوئی ہے[4]۔

ممکن ہے قرآن کو تیس پاروں میں تقسیم کرنے کا خیال لوگوں کو صحیح بخاری کی اس روایت سے پیدا ہوا ہو کہ جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے فرمایا کہ قرآن ایک مہینہ میں ختم کیا کرو اور جب انھوں نے عرض کیا کہ میں تو اس سے زیادہ پڑھنے کی طاقت رکھتا ہوں، تو فرمایا، اچھا تو پھر ایک ہفتہ میں قرآن ختم کیا کرو، لیکن روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہتر یہی ہے کہ ایک مہینہ میں ختم کیا جائے۔

---

[1] ایضاً بحوالہ الاتقان

[2] تاریخ القرآن صارم ص ۱۰۸

[3] ایضاً ص ۱۰۵

[4] مناہل العرفان ص ۴۰۲

زرکشی (م ۷۹۴ھ) نے لکھا ہے کہ قرآن کے تیس (۳۰) اجزا عام طور پر مشہور ہیں جو مدارس وغیرہ میں پڑھائے جاتے ہیں[۱]

ایک دور ایسا بھی گذرا ہے کہ ہر دس آیتوں کے ختم پر عشر جس کے معنیٰ دس ہیں لکھ دیتے تھے یا پورا عشر لکھنے کی بجائے اس کے پہلے حرف ع کے شروع کا حصّہ (ؑ) بنا دیا کرتے تھے اور پانچ آیتوں کے ختم پر خمس جس کے معنی پانچ کے ہیں لکھ دیا کرتے تھے یا خمس کے پہلے حرف خ کے شروع کا حصّہ (خ) بنا دیتے تھے[۲]

زرکشی لکھتے ہیں کہ دس آیتوں کے بعد نشان لگانے کا حکم مامون عباسی خلیفہ نے دیا اور یہ بھی کہا گیا کہ حجاج بن یوسف نے اس کی ابتدا کی[۳]

تیسری صدی ہجری کے آخر تک علمار میں اس پر اختلاف رہا کہ قرآن میں نقطے لگانا جائز ہے یا نہیں، کچھ کہتے تھے کہ جائز ہے اور کچھ اس کو جائز نہیں رکھتے تھے، پھر علمار کی ایک جماعت نے کہا کہ نقطے لگانا تو جائز ہے لیکن پانچ آیتوں کے ختم پر یا دس آیتوں کے ختم پر کسی نشان کا لگانا جائز نہیں، یہ بات پانچویں صدی ہجری کے شروع میں بعض علماز نے کہی، وہ کہتے تھے کہ

---

[۱] البرھان فی علوم القرآن ص ۲۵۰ ج ۱

[۲] مباحث فی علوم القرآن، ڈاکٹر صبحی صالح ص ۹۷

[۳] البرھان فی علوم القرآن ج ۱ ص ۲۵۱

یہ دین میں نئی بات پیدا کرنا ہے اس لئے قطعاً جائز نہیں ہے [1]۔

تمام سورتوں کے نام توقیفی ہیں جو وحی الٰہی کے اشارے پر رکھے گئے ہیں اور یہ احادیث و آثار سے ثابت ہے جیسا کہ سیوطی نے لکھا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی سورتوں کے نام لے کر ان کے فضائل بیان فرمائے ہیں، حدیث کی مستند کتب میں ایسی بہت سی روایات موجود ہیں۔

"ہر سورت کے ابتدا میں بسم اللہ لکھی جاتی تھی، حضرت عثمانؓ کے عہد سے سورتوں کے نام بھی لکھے جانے لگے [2]"

حجاج بن یوسف نے جو علماء و قرّاء کی ایک مجلس بنائی تھی اس نے قرآن کے حروف شمار کئے اور سیپارہ کو ربع، نصف اور ثلث میں تقسیم کیا، یہ تقسیم باعتبار حروف ہوئی ہے [3]۔

قرآن مجید کا رسم الخط آج تک وہی ہے جو زمانہ رسالتؐ میں تھا یہ رسم الخط دنیا کے تمام خطوں سے علیحدہ ہے، یہ رسم نہ پہلے کبھی تھا اور نہ آج تک کسی خط میں رائج ہے، ایک جگہ ایک لفظ کو دراز تا سے لکھا ہے دوسری جگہ اسی لفظ کو گول تا سے جیسے فطرت، فطرۃ، رحمت، رحمۃ، سنت، سنۃ۔

---

[1] تفصیل کے لئے مباحث فی علوم القرآن ص ۹۵-۹۶

[2] تاریخ القرآن از مولانا صارم ص ۱۰۳

[3] تاریخ القرآن مولانا صارم بالحذف والاضافہ ص ۱۰۶-۱۰۸

بعض جگہ ایک لفظ کو ملا کر لکھا ہے اس کو موصول کہتے ہیں اور دوسری جگہ جدا جدا لکھا ہے اس کو مقطوع کہتے ہیں جیسے کلّما، کلّ ما، بئسما، بئس ما، فیما، فی ما یہاں صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا گیا ہے[1]

اس وقت تک بھی قرآن میں ایسے الفاظ ہیں جو موجودہ قواعد خط اور تحریر کے خلاف ہیں، لیکن وہ حروف چوں کہ صاحب شریعت کے سامنے اِسی طرح لکھے گئے تھے اس لئے مسلمانوں نے اُسے بھی ویسے ہی قائم رکھا، اور قواعد خط کے موافق اس میں تبدّل اور تغیّر پسند نہیں کیا[2]

---

[1] تاریخ القرآن مولانا صارم بالحذف والاضافہ ص ۱۰۶ - ۱۰۸

[2] تاریخ القرآن رحمانی ص ۱۳۴

باب دوم

اسباب النزول

یا

شانِ نزول

باب دوم

اسباب النزول یا شانِ نزول

اسبابُ النزول یا شانِ نزول[1]

قرآنی آیات کی ایک قسم تو وہ ہے کہ جن کا نزول کسی خاص وجہ یا سبب سے نہیں ہوا بلکہ ان کے نزول کا سبب لوگوں کو حق اور سچائی کا راستہ دکھانا، منزلِ مقصود تک پہنچنے کے طریقے بتانا اور ان کی تربیت کرنا ہے، تاکہ وہ ان آیات کی روشنی میں دنیا اور دین کی بھلائی حاصل کر سکیں، اسی مناسبت سے قرآن مجید میں گزری ہوئی قوموں کے حالات اور واقعات بیان کئے گئے ہیں، ان میں سے جنھوں نے احکامِ خداوندی پر عمل کیا ان کو طرح طرح کی

---

[1] بعض مفسّرین نے "اسباب النزول کو زیادہ اہمیت دی ہے اور ان کی اس موضوع پر مستقل تصانیف ہیں۔ امام بخاریؒ کے شیخ علی بن المدینی (وفات ۲۳۴ھ) نے اور علی بن احمد الواحدی (وفات ۴٦۸ھ) نے "اسباب النزول" پر اسی نام سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ (وفات ۹۱۱ھ) کی کتاب "لباب النقول فی اسباب النزول" اسی موضوع پر ہے جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے۔ ان کے علاوہ متعدد کتب اسی موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ اسباب النزول پر سب سے پہلے حضرت عکرمہ مدنیؒ نے جو کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے نامور شاگرد ہیں کتاب لکھی اور اس میں وہ قیمتی معلومات جمع کیں کہ جو اپنے استاذ سے سنی تھیں۔

نعمتوں سے نوازا گیا، اور جنھوں نے سرکشی اور نا فرمانی کی ان کو سزائیں دی گئیں۔ قرآن مجید میں ان واقعات اور حالات کے بیان کو شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے "الفوز الکبیر" میں تذکیر بایام اللہ سے تعبیر کیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فرماں برداروں کے لئے انعام اور نافرمانوں کے لئے سزا کا قانون سب سے پہلے اللہ نے بنایا ہے۔[1]

گزشتہ قوموں کے واقعات عرب لوگ اپنے بزرگوں سے سنتے چلے آتے تھے اس لئے نصیحت و عبرت کے لئے قرآن مجید نے ان کو یاد دلایا، اسی طرح قرآن مجید میں زمانۂ نزول کے حالات اور کہیں کہیں مستقبل میں پیش آنے والی باتوں کا بھی ذکر ہے۔ قرآن کی آیتوں کی وہ قسم کہ جو کسی سبب سے نازل نہیں ہوئی ہے اس کا اسباب نزول کی بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

آیات کی دوسری قسم وہ ہے کہ جن کے نزول کا تعلق کسی خاص وجہ یا سبب سے ہے، علوم القرآن کی اصطلاح میں اس کو "سبب النزول" کہا جاتا ہے، اور شانِ نزول بھی اسی کو کہتے ہیں۔

تفسیر کی کتابوں میں اسباب النزول کا ذکر

تفسیر کی اکثر کتابوں میں یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ تقریباً ہر آیت

---

[1] الفوز الکبیر ص ۴۹ (اردو ترجمہ از مولوی رشید احمد انصاری)

کے متعلق کوئی نہ کوئی قصہ یا واقعہ سبب نزول یا شانِ نزول کے طور پر بیان کردیا جاتا ہے اور کبھی تو آیتوں کے ساتھ ایک سے زیادہ واقعات کا ذکر ہوتا ہے جو بعض اوقات ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہوتے ہیں کہ ان کو کوئی سمجھدار شخص سبب نزول مان ہی نہیں سکتا، اور اس سلسلے میں جو روایات بیان کی جاتی ہیں، ان کا بسا اوقات اُن آیتوں سے کوئی جوڑ نہیں ہوتا اگر ان کو سبب نزول تسلیم کرلیا جائے تو آیتوں کا باہمی ربط و تسلسل خطرہ میں پڑجاتا اور کبھی کبھی تو ختم ہوتا نظر آتا ہے اور نتیجہ کے طور پر آیتوں پر غور کرنے والے کو یہ خیال پیدا ہونے لگتا ہے کہ اگر قصوں اور روایات سے الگ ہوکر صرف آیتوں پر غور کیا جاتا تو ان میں زیادہ ربط و مناسبت نظر آتی۔

ایسی صورت میں آیتوں کا مطلب سمجھنے کے لئے کھینچ تان کر ان کا کسی واقعہ یا روایت سے جوڑ لگانا بالکل غیر ضروری ہے لیکن جس شانِ نزول سے کسی آیت یا آیتوں کی وضاحت ہوتی ہو، یا سبب نزول جاننے سے ان کے سمجھنے میں مدد ملتی ہو یا اس کے جانے بغیر ان کا مطلب سمجھ میں نہ آسکتا ہو تو اس قسم کے مواقع پر تفسیروں میں بیان کئے ہوئے واقعات اور مستند روایات سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

قرآن مجید میں ایسے مواقع بہت زیادہ نہیں ہیں کہ جہاں شانِ نزول جاننا آیت یا آیتوں کا مطلب سمجھنے کے لئے ضروری ہو جیسا کہ شاہ ولی اللہ رح نے فرمایا ہے۔

قرآنِ کریم کی آیتوں پر غور کرنے کا بہتر طریقہ یہی ہے کہ پہلے صرف ان ہی پر غور کیا جائے اور جب اس کا اندازہ ہوجائے کہ ان میں کیا بات بتائی یا سمجھائی گئی ہے تو پھر مزید اطمینان حاصل کرنے کے لئے ان روایات اور واقعات پر بھی غور کیا جاسکتا ہے کہ جن کو مفسّرین نے سببِ نزول یا شانِ نزول کے طور پر ذکر کیا ہے بشرطیکہ وہ مستند ہوں۔

سببِ نزول کسے کہتے ہیں

سبب النزول وہ ہے کہ آیت یا آیتوں میں اس کے بارے میں کچھ بتایا گیا ہو یا یہ کہ کوئی واقعہ ایسا پیش آیا کہ جس کے متعلق کسی حکم کا انتظار تھا اور وہ نازل ہوگیا، یا شبہات دور کرنے کے لئے کسی تفصیل کی یا مخالفین کی سازش کا پردہ چاک کرنے اور مومنین کو ان کے منصوبوں سے واقف کرنے کی ضرورت تھی، یا کسی حکمت یا اہم بات کا بیان مقصود تھا کہ جس کو بتادیا گیا۔

سببِ نزول کے دائرہ میں یہ بھی آجاتا ہے کہ کسی صحابیؓ یا صحابیہؓ نے یا ایک ساتھ مل کر چند صحابہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بات دریافت کی یا مشرکین و یہود نے امتحان کے طور پر آپؐ سے کچھ پوچھا اور اس کا جواب آیت یا آیات قرآنی میں دے دیا گیا۔ اسی طرح اگر کوئی ایسا واقعہ یا حادثہ پیش آیا کہ جو گناہ یا قصور تھا، یا کسی نے کوئی قابلِ تعریف کام کیا

یا تشریعی حیثیت کا حامل ہونے کی وجہ سے جس کا لوگوں پر ظاہر کر دینا ضروری تھا[1]۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جو واقعہ یا حادثہ نزول کا سبب رہا ہے اس کے فوراً بعد آیت یا آیات کا نزول ہوا ہو بلکہ کچھ مدت کے بعد بھی ہو سکتا ہے، جب مناسب وقت آیا اس کو ظاہر کر دیا گیا۔

---

[1] قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روح، اصحاب کہف اور ذوالقرنین سے متعلق امتحان کے طور پر پوچھا، آپؐ نے وحی الٰہی کے بھروسہ پر (ان شاء اللہ کہے بغیر وعدہ فرمالیا کہ کل جواب دوں گا) لیکن وحی الٰہی کئی دن تک نازل نہیں ہوئی جس کی وجہ سے آپؐ کو رنج ہوا، جب وحی الٰہی نازل ہوئی تو جواب کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا وَلَا تَقُولَنَّ لِشَایْءٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَٰلِكَ غَدًا إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ وَاذْكُر رَّبَّكَ إِذَا نَسِيتَ وَقُلْ عَسَىٰ أَن يَهْدِيَنِ رَبِّي لِأَقْرَبَ مِنْ هَٰذَا رَشَدًا (سورۃ الکہف پ ۱۵- آیت ۲۴) اور آپؐ کسی کام کی نسبت یہ نہ کہا کیجئے کہ میں اس کو (مثلاً) کل کروں گا مگر خدا کے چاہنے کو ملادیا کیجئے (یعنی انشاء اللہ تعالیٰ وغیرہ بھی ساتھ کہہ دیا کیجئے) اور جب آپ (اتفاقاً انشاء اللہ کہنا) بھول جائیں (اور پھر یاد آجائے) تو اپنے رب کا ذکر کر لیا کیجئے اور کہہ دیجئے کہ مجھ کو امید ہے کہ میرا رب مجھکو (نبوت کی) دلیل بننے کے اعتبار سے اس (اصحاب کہف اور ذوالقرنین وغیرہ کے بارے میں جو تم نے پوچھا ہے) پہلے سے بھی نزدیک تر بات بتلادے۔ حضرت عکرمہ رح سے روایت ہے کہ اہل کتاب نے بھی آپؐ سے روح کے متعلق سوال کیا تھا۔ تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۶۰

ھلال بن امیہؓ نے اپنی بیوی پر تہمت لگائی اور جو کچھ دیکھا تھا تفصیل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیان کر دیا۔ اس پر "سورۃ النور" کی وہ آیتیں نازل ہوئیں کہ جن میں لعان کا حکم دیا گیا ہے اور لعان کا طریقہ بتلایا گیا ہے اور ھلال بن امیہؓ کا واقعہ ان آیتوں کا سببِ نزول بن گیا۔ اسی طرح منافقوں نے کہ جن کا سرغنہ عبداللہ بن اُبی تھا، اور جس کے ساتھ بعض سادہ لوح مسلمان بھی شریک ہو گئے تھے، حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی تو یہ واقعہ "سورۃ النور" کی ان دس آیتوں کے نازل ہونے کا سبب بن گیا کہ جن میں مخالفین کی سازش سے مومنین کو باخبر کیا گیا۔ اس الزام کو بہت بڑا بہتان بتایا گیا۔ حضرت عائشہؓ کی براءۃ نازل ہوئی اور یہ تعلیم دی گئی کہ ایسے مواقع پر مومنین کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ تقریباً ایک ماہ کے بعد یہ آیتیں نازل ہوئیں، اسی طرح آیاتِ ظہار کے نازل ہونے کا سبب اوس بن الصامتؓ کا واقعہ بنا کہ جب انھوں نے اپنی بیوی خولہؓ سے ظہار کے الفاظ کہہ دیئے جس کی وجہ سے وہ پریشان ہوئیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر واویلا کرنے لگیں۔ ظہار کے احکام سورۃ المجادلہ کی شروع کی آیتوں میں ہیں۔

مذکورہ بالا تمام واقعات حدیث و تفسیر کی کتابوں میں تفصیل سے ذکر کیے گئے ہیں؛ ان حوادث و واقعات سے متعلق نازل ہونے والی آیات اور احادیث کے پیشِ نظر فقہاء نے لعان

قذف اور ظہار کے احکام و مسائل مدوّن کر دیئے کہ جو فقہ اسلامی کے مستقل ابواب بن گئے۔

ایسا بھی ہوا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا آپؐ کے صحابہؓ میں سے کسی کے دل میں کوئی خیال آیا کہ ایسا ہوتا تو بہت اچھا تھا اور جلد ہی اُسی کے مطابق کوئی آیت یا آیات نازل ہوگئیں اور وہ آرزو ان کے نازل ہونے کا سبب بن گئی[۱]

عموم لفظ کا اعتبار کیا جائے گا یا خصوص سبب کا

علماء اصول کا اس دقیق مسئلہ میں اختلاف ہے کہ عموم لفظ کا اعتبار کیا جائے گا یا خصوص سبب کا؟ مثلاً کوئی حادثہ پیش آیا اور اسکے بارہ میں آیت نازل ہوئی تو کیا اس صورت

---

[۱] سیوطی نے "الاتقان فی علوم القرآن" کی دسویں نوع میں قرآن کے ان حصّوں کو بیان کیا ہے کہ جو بعض صحابہ رضہ کی زبان پر جاری شدہ الفاظ کے مطابق نازل ہوئے اور کہا ہے کہ یہ درحقیقت اسباب نزول ہی کی ایک نوع ہے، اور اسکی اصل حضرت عمر رضہ کے موافقات ہیں یعنی وہ باتیں جو انھوں نے کہیں اور پھر ان ہی کے مطابق قرآن کا نزول ہوا، سیوطی نے لکھا ہے کہ بہت سے علماء کی اس موضوع پر مستقل تصانیف ہیں۔

(الاتقان عربی ص ۴۰)

ہیں اس آیت کا حکم اسی حادثہ، واقعہ یا اُسی شخص کے لئے ہوگا کہ جس کے بارہ میں آیت نازل ہوئی ہے، یا ایسا نہیں ہوگا بلکہ اس آیت کا حکم عام ہوگا اور جب بھی اس قسم کا حادثہ یا واقعہ پیش آئے گا تو کسی طرح کی تخصیص کے بغیر اُسی آیت کے مطابق حکم دیا جائے گا، جمہور علماء یہی کہتے ہیں اور ان کی دلیل یہ ہے کہ ظہار کی آیت کا نزول اوس بن الصامتؓ، لعان کی آیت کا نزول ھلال بن امیہؓ، اور حد قذف (جھوٹی تہمت کی سزا) کی آیتوں کا نزول حضرت عائشہؓ پر تہمت لگانے والوں کے لئے تھا، لیکن جب بھی کوئی اس قسم کی صورت پیش آئے گی تو ان ہی آیتوں کے مطابق حکم دیا جائے گا، اور اس قسم کی قرآن مجید میں بہت سی آیتیں ہیں۔

بدرالدین زرکشی "خصوص السببُ عمومُ الصیغہ" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں۔

وقد یکون السببُ خاصًا	اور کبھی سبب خاص اور صیغہ عام اس بات
والصیغۃ عامۃً لینبّہ علی	سے آگاہ کرنے کے لئے ہوتا ہے کہ
ان العبرۃ بعمومِ اللفظ	اعتبار لفظ کے عموم کا ہے اور زمخشری متوفی
وقال الزمخشری فی نفس	نے سورۃ الھُمَزَۃ کے متعلق کہا ہے ہو سکتا ہے
سورۃ الھُمَزَۃ: یجوز ان	کہ (اس کے نزول کا) سبب خاص ہو لیکن
السبب خاصًا والوعیدُ عامًا؛	وعید (دھمکی) عام ہے تاکہ وہ ہر اس شخص
لیتنا ول کل من باشر ذلک	کو شامل ہو جائے کہ جو اس گھناؤنی یا
القبیح ۱؎	مکروہ چیز کا مرتکب ہو۔

۱؎ البرھان فی علوم القرآن ج ۱ ص ۱۲۲

قاضی بیضاویؒ نے لکھا ہے کہ "اس سورۃ (سورۃ الھمزۃ) کا نزول اخنس بن شریق یا ولید بن المغیرہ کے بارہ میں ہوا ہے"[1] یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غیبت کرتے اور آپ کو طعنے دیا کرتے تھے، اور اس کے علاوہ ان میں دوسری برائیاں بھی تھیں۔

زرکشی اور زمخشری[2] کے نزدیک یہ دھمکی یا وعید عام ہے اور صرف ان ہی لوگوں کے لئے نہیں ہے کہ جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غیبت کی یا آپ کو طعنے دئے۔

شاہ ولی اللہ متوفی ۱۱۷۶ھ اور قرآن فہمی کے باب کی ایک عام غلطی کی اصلاح

مولانا عبید اللہ سندھیؒ مذکور بالا عنوان کے تحت اپنے اس مقالہ میں کہ جو انھوں نے "امام ولی اللہ دہلویؒ" پر لکھا ہے، شاہ صاحبؒ کے خیالات وافکار کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

فقہاء عظام نے قرآن عظیم کو اپنی "اصول فقہ" میں پہلے درجہ پر رکھا ہے، مگر اس سے مراد ان کے یہاں چند آیات احکام

---

[1] بیضاوی ج ۲ ص ۴۲۹، تفسیر سورۃ الھمزۃ، مطبوعہ نولکشور لکھنؤ۔

[2] محمود بن عمر بن محمد بن احمد، جار اللہ ابو القاسم الزمخشری متوفی ۵۳۸ھ۔ الکشاف واساس البلاغۃ والمفصل والفائق ۔ (اعلام ۸/۵۵)

ہیں، جو اوامر و نواہی کی شکل میں قرآنِ حکیم میں مدوّن ہیں، اس تخصیص کا یہ اثر ہوا کہ ایک عالم سارا قرآن سمجھنا ضروری نہیں جانتا پھر اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کی تفسیر واعظوں اور قصہ گو افسانہ طراز لوگوں کے ہاتھ آگئی اور فقہاء کا اس میں دخل نہ رہا۔

ائمہ فقہاء نے اپنے اصول میں بالاتفاق یہ مسئلہ درج کیا ہے کہ اگر قرآن شریف میں ایک آیت بلفظ عموم نازل ہوئی ہو اور مفسرین اس کا کوئی خاص واقعہ سبب (نزول) بتاتے ہوں تو قرآن فہمی میں عموم الفاظ ہی مدّ نظر رہے گا خصوصیت محل کو اس میں دخل نہیں ہوگا۔

اس قاعدہ پر اتفاق کرتے ہوئے آپ جس تفسیر کو اٹھا کر دیکھیں گے، ہر آیت کے ماتحت ایک جزئی واقعہ پائیں گے مثلاً یہ آیت ابوجہل کے حق میں ہے، یہ عبداللہ بن اُبی کے بارہ میں نازل ہوئی، یہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی فضیلت میں اتری، اس میں اہل بیت کے فضائل کا بیان ہے۔ عام اساتذہ اور طلبہ کو آپ ان ہی جزئی چیزوں میں غور کرتا ہوا پائیں گے۔ شاہ صاحبؒ نے "الفوز الکبیر" کی ابتدا میں اس غلطی کو نہایت وضاحت سے بیان کردیا ہے، اور آیات احکام کا مطلب یہ بتلایا ہے کہ اجتماعی طور پر انسانوں میں جو بداخلاقیاں اور بداعمالیاں موجود ہیں اُن کو ان آیات کا سبب نزول سمجھنا چاہیئے، عرب یا عجم، زمانہ کے تقدم یا تاخر سے ان کو کوئی تعلق نہیں[1]۔

---

[1] الفرقان، ولی اللہ نمبر (دوسرا اڈیشن) ص ۲۵۹-۲۶۰ مطبوعہ محبوب المطابع (دہلی)

سبب نزول جاننے کے فوائد

سبب نزول کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اس کے جاننے سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہے اور اس کی حیثیت محض ایک تاریخی ہے۔ سبب نزول کی اہمیت سے انکار کی یہ دلیل معقول نہیں ہے، اس لئے کہ حادثات اور واقعات کے اسباب جانے بغیر کوئی مورخ خواہ وہ تاریخ پر کتنی ہی گہری نظر رکھتا ہو تاریخی اعتبار سے صحیح نتائج اور حقائق تک نہیں پہنچ سکتا، کسی چیز کا تاریخی حیثیت کا حامل ہونا اس کی اہمیت کو کم نہیں کرتا، یہ ایک ایسی ظاہر بات ہے کہ جس پر کسی دلیل کے قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ شیخ ابوالفتح القشیری (متوفی ۵۲۱ھ) کہتے ہیں:

سبب نزول کا بیان قرآن مجید کے معانی سمجھنے کا ایک قابلِ اعتماد طریقہ ہے[۱]

علامہ جلال الدین سیوطی رہ نے اپنی کتاب "لباب النقول فی اسباب النزول" میں لکھا ہے کہ بعض محققین علماء نے کہا ہے کہ جو شخص اسباب نزول سے واقف نہ ہو اس کے لئے قرآن کی تفسیر جائز نہیں ہے۔

واحدی "اسباب النزول" میں لکھتے ہیں[۲] کہ قرآن میں ایسی

---

[۱] البرھان فی علوم القرآن، بدرالدین زرکشی ص ۲۲

[۲] اسباب النزول، ابوالحسن علی بن احمد الواحدی النیسابوری ۴۶۸ھ ص ۴ مطبوعہ مصر

آیتیں ہیں کہ اگر ان سے متعلق واقعہ یا سبب معلوم نہ ہو تو ان کا مطلب سمجھ میں نہیں آسکتا،

اسباب نزول کے بارہ میں وہی قول مانا جائے گا جس کی روایت یا سماع ان لوگوں سے ثابت ہو کہ جو نزول قرآن کے زمانہ میں تھے اور اسباب نزول سے واقف تھے ان کے جاننے کے لئے تحقیق و تلاش کا اہتمام کرتے تھے۔

ابن تیمیہؒ (متوفی ۷۲۸ھ) کہتے ہیں کہ سبب نزول کے جان لینے سے آیت کا مطلب سمجھنے میں مدد ملتی ہے کیونکہ سبب کے علم سے مسبب کا علم حاصل ہوتا ہے[۱]۔ مذکورہ بالا اقوال کا تعلق ان ہی آیتوں سے ہے کہ جو کسی سبب سے نازل ہوئی ہیں۔

علامہ شاطبیؒ[۲] نے لکھا ہے کہ جو شخص قرآن سمجھنا چاہتا ہے اس کے لئے اسباب النزول کا جاننا ضروری ہے اور اس کی دلیل میں دو باتیں پیش کی ہیں۔

پہلی یہ کہ کلام اگر حالات و مقام کے تقاضے کے مطابق ہے تو اس کو فصیح و بلیغ کہا جائے گا، لیکن اس کا فیصلہ کرنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ کلام کے وقت کیا حالات تھے، ان کے جاننے کے بعد ہی یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ ان حالات میں

---

[۱] التبیان فی علوم القرآن، محمد علی صابونی ص ۴۴، مطبوعہ بیروت
[۲] ابراہیم بن موسیٰ اللخمی الغرناطی المالکی المتوفی ۷۹۰ھ

میں کلام کس ڈھنگ اور طریقے سے کرنا چاہیئے تھا، اگر اس کا خیال رکھا گیا تو کلام بلیغ و فصیح ورنہ اس کو بلاغت کے معیار سے گرا ہوا کہا جائے گا، اس لئے کہ وہ حالات کے تقاضوں کے لحاظ سے بد لتا رہتا ہے، کلام یا گفتگو کرنے والا جس سے گفتگو کر رہا تھا اس نے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے گفتگو کی یا نہیں؟ ایک ہی بات جب دو حالتوں یا دو شخصوں سے کی جاتی ہے تو اس کا مفہوم مختلف ہو جاتا ہے، ہو سکتا ہے کہ کلام کے وقت جو حالات تھے ان کو دیکھ کر جو مطلب کسی شخص نے سمجھا، دوسرا شخص کہ جس نے وہ خود وہ حالات نہیں دیکھے اسی کلام کا کچھ اور مطلب سمجھے کہ جو حالات دیکھنے والے کے سمجھے ہوئے مطلب سے بالکل مختلف ہو، جیسے کہ کلام استفہام کہ حالات و مقام کے تقاضوں کے لحاظ سے وہ کبھی کسی بات کے پوچھنے یا دریافت کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے، کبھی بظاہر تو استفہام ہوتا ہے لیکن مقصود نفی ہوتی ہے، کبھی استفہام کے انداز میں کسی کام سے باز رکھنا مقصود ہوتا ہے، یا جیسے امر کہ جس کے معنی حکم دینے کے ہیں، اصولاً حکم دینے والے کی شان اس سے برتر ہوتی ہے کہ جس کو حکم دیا جاتا ہے، لیکن بسا اوقات یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ امر کے صیغے سے حکم مقصود نہیں ہوتا بلکہ مجازاً اس سے دوسرے معانی مراد لئے جاتے ہیں کیونکہ اس وقت کی حالت اسی کی مقتضی ہوتی ہے، مثلاً دھمکی دینے کے لئے کہنے والا کہتا تو یہی ہے کہ اچھا ایسا کرو لیکن اس وقت اور حالت کے لحاظ

سے کہنے والے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر چاہو گے تب بھی ایسا نہیں کرسکتے، یا یہ کہ تم ایسا کرتو لو گے لیکن تم کو اس کے سنگین نتائج بھگتنا پڑیں گے، کبھی بظاہر حکم دیا جاتا ہے، لیکن حالات کے پیشِ نظر مقصود صرف اجازت ہوتی ہے کہ اس کام کو چاہو کرو چاہو نہ کرو، اسی قسم کی بہت سی چیزیں ہیں کہ جن کی وجہ سے ایک ہی کلام کا مطلب بدلتا رہتا ہے[۱]، جن حالات میں وہ کلام کیا جاتا ہے وقت گزرنے کی وجہ سے وہ تو باقی نہیں رہتے، لیکن وہ کلام بعد میں جب نقل کیا جاتا ہے تو سننے والے کے سامنے صرف الفاظ ہوتے ہیں نہ کہ حالات جو اس کا صحیح مفہوم و مطلب سمجھنے میں بہت معاون ہوتے ہیں اور اسی لئے قرآن مجید کا مطلب سمجھنے کے لئے ایسی صورتوں میں سبب کا جاننا ضروری ہے اور سبب کے جاننے سے مراد اس بات کا جاننا ہے کہ آیت یا آیات کا نزول کن حالات میں ہوا یا ان کے نزول کے وقت حالات کس چیز کے متقاضی تھے اور ان کو زیادہ بہتر وہی سمجھ سکتا ہے کہ جو کلام کے وقت موجود تھا۔

دوسری یہ کہ اگر اسبابِ نزول سے واقفیت نہیں ہے تو آیت کا مطلب سمجھنے میں شبہات پیدا ہوں گے جو شدید اختلافات کا

---

[۱] قرآن مجید اور کلامِ عرب وغیرہ میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں جن کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے۔

باعث بن سکتے ہیں، علامہ شاطبیؒ نے حضرت عمر فاروق کا ایک واقعہ بھی لکھا ہے کہ بہت غور و فکر کے بعد انھوں نے یہ رائے قائم کی کہ جس امت کا نبی ایک ہو اور اس کا قبلہ بھی ایک ہو اس میں اختلاف پیدا ہو جانے کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی، یہ سن کر حضرت ابن عباسؓ نے کہا " امیر المومنین رضؓ قرآن مجید تو ہمارے سامنے نازل ہوا ہے، ہم نے اس کو پڑھا ہے اور ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ وہ کیسے اور کن حالات میں نازل ہوا، لیکن وہ وقت دور نہیں کہ ہمارے بعد کے لوگ قرآن پڑھیں گے اور ان کو یہ معلوم نہ ہوگا کہ وہ کن حالات اور کس موقع پر نازل ہوا ہے، اور ایسی صورت میں باہمی اختلاف پیدا ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے جو جھگڑوں اور خوں ریزی کی وجہ بن سکتا ہے، لیکن حضرت عمر رضؓ نے ان کو جھڑک دیا اور حضرت ابن عباسؓ وہاں سے چلے گئے، کچھ دیر تک حضرت عمر رضؓ اُن کی باتوں پر غور کرتے رہے اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ حضرت ابن عباسؓ کی رائے ٹھیک معلوم ہوتی ہے، کسی شخص کو بھیج کر انھیں بلوایا اور فرمایا کہ جو بات کچھ دیر پہلے تم نے کہی تھی ذرا پھر کہو، حضرت ابن عباس رضؓ نے اسکو دھرایا، حضرت عمر رضؓ نے اس کو پسند فرمایا اور کہا کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔[1]

---

[1] الموافقات لابی اسحاق الشاطبی ج ۳ ص ۳۴۷ - ۳۴۸ بالحذف والاضافۃ (ابراھیم بن موسیٰ اللخمی الشاطبی المالکی المتوفی ۷۹۰ھ)

سببِ نزول کی اہمیّت

قرآن مجید میں ایسی آیات بھی ہیں کہ اگر ان کا شانِ نزول معلوم نہ ہو تو ان کا مطلب پورے طور پر سمجھ میں نہیں آ سکتا اور اس سے سببِ نزول جاننے کی ضرورت اور اہمیّت سمجھ میں آ جاتی ہے۔ جیسے کہ سورۃ البقرہ کی آیت وَ لِلّٰہِ الْمَشْرِقُ والمغرب فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ[1] اور اللہ ہی کا ہے مشرق اور مغرب بھی، تو تم جس طرف بھی رُخ کرو گے وہاں اللہ کی ذات (موجود) ہے۔

علاّمہ واحدی نے "اسباب النّزول" میں اس آیت کے کئی سببِ نزول لکھے ہیں، اُن میں سے دو درج ذیل ہیں۔

چند صحابہ رضؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر کی ایک اندھیری رات میں نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا، ان لوگوں کو قبلہ کی ٹھیک سمت کا علم نہ تھا، ہر شخص نے جس طرف اس کا دل جھکا نماز پڑھ لی، جب صبح ہوئی تو صحابہ رضؓ نے آپؐ سے رات کی نماز کا ذکر کیا اس پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی۔

فقہائے احناف نے جائز رکھا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی

---

[1] ویطلق الوجہ علی الذات، یقال وھو یبتغی وجہ اللہ ای ذاتہ۔ تاج العروس ج ۹ ص ۳۴۰

جگہ ہو کہ جہاں سمت قبلہ کسی ذریعہ سے بھی معلوم نہ ہو سکتی ہو تو جس طرف اس کا دل گواہی دے نماز پڑھ لے۔

مدینہ میں یہودی بڑی تعداد میں تھے، ہجرت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ نماز میں بیت المقدس کی طرف رُخ کریں، اس سے یہود کو بڑی خوشی ہوئی، لیکن آپؐ کا دل چاہتا تھا کہ کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھا کریں، آپؐ کی یہ آرزو پوری کی گئی تو یہود نے اعتراض کیا کہ مسلمانوں نے قبلہ کی سمت کیوں بدل دی اور اس پر مذکورہ[۱] بالا آیت نازل ہوئی۔[۲]

یا جیسے یہ آیت۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ	اے ایمان والو تمھاری بعض بیویاں
مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ	اور اولاد تمھاری دشمن ہیں لہٰذا تم

---

[۱] اسباب النزول، ابوالحسن علی بن احمد الواحدی النیسابوری (م ۴۶۸ھ) ص ۲۳-۲۴۔ [۲] اسباب نزول کے فوائد کے ضمن میں زرکشی لکھتے ہیں۔

ومن ذلك قوله تعالیٰ وللّٰه المشرق والمغرب فاينما تولوا فثم وجه اللّٰه وخانا لو تركنا مدلول اللفظ لاقتضی ان المصلی لا يجب عليه استقبال القبلة سفرا ولا حضرا وهو خلاف الاجماع فلا يفهم مراد الاية حتی يعلم سببها وذلك انها نزلت لما كان صلی اللّٰه عليه وسلم علی راحلته وهو مستقبل من مكة الی المدينة حيث توجهت به فعلم ان هذا هو المراد (البرهان فی علوم القرآن ج ۱ ص ۲۹ - بدرالدین زرکشی ولادت ۷۴۵ھ وفات ۷۹۴ھ)

عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

ان سے ہوشیار رہو اور اگر تم معاف کردو اور درگذر کر جاؤ اور (ان کی خطا) بخش دو تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

سورۃ التغابن پ ۲۸ آیت ۱۴

اس آیت کا شانِ نزول زرکشی[1] نے یہ بیان کیا ہے کہ کچھ لوگوں نے جہاد پر جانے کا ارادہ کیا تو ان کی بیویوں اور اولاد نے روکا، اس پر مذکورہ بالا آیت کا ابتدائی حصہ "فَاحْذَرُوْهُمْ" تک نازل ہوا، اسکے بعد باقی حصہ نازل ہوا کہ جس میں معاف کردینے اور خطاؤں کو بھول جانے کی ترغیب ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی بتادیا گیا کہ اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

سبب نزول معلوم ہو جانے کے بعد یہ سمجھ میں آگیا کہ بیویوں اور اولاد کو دشمن اس لئے کہا گیا کہ دینی امور پر عمل کرنے سے کسی کو روکنا یا ایسے حالات پیدا کرنا کہ جن کی وجہ سے اُن پر عمل دشوار ہو جائے، دشمنی کرنے کے برابر ہے، اسی لئے ایسا کرنے والوں کو دشمن کہا گیا اور ہدایت کی گئی کہ تم ان سے ہوشیار رہو۔ جب کچھ لوگوں نے ان کے ساتھ ضرورت سے زیادہ سختی کا برتاؤ کرنا شروع کر دیا اور ان کے قصور کو ناقابلِ معافی جرم سمجھنے لگے تو اس آیت کا آخری حصہ نازل کیا گیا

---

[1] البرھان فی علوم القرآن ص ۲۹ ج ۱، الطبعۃ الاولیٰ ۱۳۷۶ھ، ۱۹۵۷ء

جس میں ان کے قصور کو معاف کردینے اور ان کی خطاؤں کو بھلا دینے کے لئے کہا گیا ہے۔

سببِ نزول کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ اسکے جاننے سے قرآن کے معانی سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے اور آیت کے ظاہری مفہوم میں جو الجھاؤ نظر آتا ہے وہ دور ہو جاتا ہے، جیسے کہ آیت؛

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَا اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۔ آل عمران ۴ آیت ۱۸۰

جو لوگ اپنے کردار (حرکات) پر خوش ہوتے ہیں اور بے کئے کاموں پر اپنی تعریف کو پسند کرتے ہیں، تم اُن کو یہ خیال نہ کرنا کہ عذاب سے بچے رہیں گے اُن کے لئے دردناک عذاب ہے۔

مروان بن حکم متوفی ۶۵ھ نے جب یہ آیت سُنی تو اپنے دربان رافع کو حضرت ابن عباس رضؓ کے پاس بھیجا اور کہا کہ ان سے جاکر پوچھو کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے کئے پر خوش ہوتا ہے اور یہ بھی چاہتا ہے کہ جو اس نے نہیں کیا ہے اس پر اسکی تعریف کی جائے اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہر شخص کو عذاب دیا جائے گا اور ہم میں سے کوئی بھی عذاب سے نہ بچ سکے گا، رافع کی بات سنکر حضرت ابن عباس رضؓ نے کہا کہ یہ آیت اہلِ کتاب کے بارے میں اُس وقت نازل ہوئی تھی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کوئی بات دریافت کی تھی، انھوں نے وہ بات تو نہیں بتائی

بلکہ کوئی اور بات بتادی، اور جانتے وقت یہ ظاہر کیا کہ جوآپ نے پوچھا تھا وہی بتایا ہے اور چاہا کہ ان کی تعریف کی جائے اور اصل بات کے چھپانے پر دل میں خوش تھے[1]۔

سبب نزول کی اہمیت اور اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ جس آیت یا جن آیتوں کا سبب نزول معلوم ہو جاتا ہے ان کا یاد کرنا اور سمجھنا بہ نسبت ان آیتوں کے زیادہ آسان ہو جاتا ہے کہ جن کے سبب نزول کا علم نہ ہو، کیونکہ جب کسی چیز کا سبب معلوم ہو جاتا ہے تو مسبب کی طرف ذہن ضرور جاتا ہے، یا کسی حکم کے متعلق اگر یہ علم ہو جائے کہ وہ اس لئے دیا گیا تھا کہ جب فلاں واقعہ پیش آیا اور اس واقعہ سے فلاں جگہ یا فلاں شخص کا تعلق تھا تو یہ سب باتیں ان آیتوں کے یاد کرنے اور ذہن میں محفوظ کرنے کا قرینہ بن جاتی ہیں۔

اصول تفسیر کے ماہرین نے مذکورہ بالا فوائد کے علاوہ سبب نزول جاننے کے متعدد فائدے بیان کئے ہیں جن سے ان کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے، لیکن اختصار کے پیش نظر یہاں ان کو ذکر نہیں کیا گیا اور صرف چند پر اکتفا کیا گیا۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۴۳۶ (حافظ عماد الدین ابوالفداء اسماعیل بن کثیر القرشی الدمشقی متوفی ۷۷۴ھ)۔ مطبوعہ مصر

سبب نزول جاننے کا طریقہ

سبب نزول کا علم صرف نقل صحیح سے ہو سکتا ہے، اسی لئے اسباب نزول کے متعلق کچھ کہنا صرف اسی صورت میں درست ہوگا جب کہ ان لوگوں کی روایات کو اسباب نزول جاننے کا ذریعہ بنایا جائے کہ جن کے سامنے قرآن کا نزول ہوا اور ان میں سے بھی وہ لوگ کہ جن کو اسباب نزول کا علم[1] تھا جو مسلسل اس جستجو میں رہتے تھے کہ ہر ممکن طریقے سے آیات قرآن کے معانی و مطالب کو جانیں اور سمجھیں، اسی لئے اصولِ تفسیر کے ماہرین نے کہا ہے کہ اگر سبب نزول کا علم کسی صحابی کی روایت سے ہو تو وہ قابلِ قبول ہوگا اگرچہ کسی دوسرے صحابی کی روایت سے اس کو تقویت حاصل نہ ہو[2]، اور یہ نہیں کہا جائے گا کہ صحابیؓ نے

---

[1] ولا یحل القولُ فی اسباب نزول الکتاب الا بالروایۃ والسماع ممن شاھدوا التنزیل ووقفوا علی الاسباب وبحثوا عن علمھا وجدوا فی الطلاب، وقد ورد الشرع بالوعید للجاھل ذی العثار فی ھذا العلم بالنار (اسباب النزول للواحدی ص ۴)

[2] اتفق اھل السنۃ علی ان الجمیع عدول ولم یخالف فی ذلک الا شذوذ من المبتدعۃ (قواعد ربانی ص ۱۳۷ بحر)

یہ بات اپنی طرف سے کہہ دی ہے، خصوصاً جب کہ وہ ایسی چیز ہو کہ جس کا تعلق سنکر کسی کی بات نقل کرنے یا دیکھنے سے ہو کیونکہ اصولاً تمام صحابہ رضؓ کی امانت و دیانت پر پورا اعتماد کیا گیا ہے، لیکن سبب نزول اگر کسی حدیث مرسل کے ذریعہ روایت کیا گیا ہو کہ جس میں سند سے صحابی ساقط ہو جاتا ہے اور وہ تابعی پر ختم ہو جاتی ہے تو پھر اس کا حکم یہ ہے کہ اس روایت کو اس صورت میں قابل قبول سمجھا جائے گا جب کہ کسی دوسری مرسل روایت سے اس کو تقویت حاصل ہو، جس کا راوی جو کہ تابعی ہے فن تفسیر میں بڑا مرتبہ رکھتا ہو، اور ان لوگوں میں سے ہو کہ جنھوں نے صحابہ کرامؓ سے استفادہ کیا ہے، مثلاً مجاہدؒ[1]، عکرمہؒ اور سعید بن جبیرؒ ان تابعین میں سے ہیں کہ جن کا علم تفسیر میں

(بقیہ حاشیہ ص ۱۳۶) ذکر الخطیب فی الکفایۃ فصلاً نفیساً فی ذلک فقال عدالۃ الصحابۃِ ثابتۃٌ معلومۃٌ بتعدیلِ اللّٰہ لہم واخبارہ عن طہارتِہم واختیارِہ لہم (الاصابہ فی تمییز الصحابۃ لابن حجر العسقلانی ج ۱ ص ۱۱۔ طبع بمطبع الاسقف فی کلکتۃ المحروسۃ)

[1] مجاہد بن جبر کی ولادت ۲۱ھ اور وفات ۱۰۴ھ میں ہوئی، مشہور تابعی ہیں، علم تفسیر میں ممتاز مقام تھا اور مشہور قاری تھے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے مشہور شاگردوں میں سے ہیں، علم تفسیر ان ہی سے حاصل کیا۔ امام بخاریؒ ان کی تفسیر پر اعتماد کرتے ہیں ۔ عکرمہؒ کی ولادت ۲۵ھ میں اور وفات ۱۰۵ھ میں ہوئی، مشہور تابعی ہیں انھوں نے بھی (بقیہ حاشیہ ص ۱۳۸ پر)

ایک خاص مرتبہ و مقام ہے اور انھوں نے صحابہ کرامؓ سے استفادہ کیا ہے[1]۔

سبب نزول سے واقفیت ایک ایسی بات ہے کہ جو صحابہ رضؓ کو اُن قرائن سے معلوم ہوتی تھی جو ان حوادث و واقعات سے متعلق ہوتے تھے جن کا تعلق آیات سے ہوتا تھا لیکن احتیاط کے خیال سے وہ سبب نزول کو یقین کے ساتھ بیان نہیں کرتے تھے۔ اور یہ کہتے کہ میرا خیال ہے کہ یہ آیت یا آیات اس بارہ میں نازل ہوئیں ہیں[2]۔

سبب نزول کن کن الفاظ سے بیان کیا جاتا ہے

سبب نزول پہچاننے میں نقل صحیح پر اعتماد کیا جاتا ہے اور

(بقیہ حاشیہ ص ۱۳۷) حضرت ابنِ عباسؓ سے قرآن اور حدیث کا علم حاصل کیا، فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کے متعلق جو کچھ بھی میں تم سے بیان کروں سمجھ لو کہ وہ میں نے ابنِ عباسؓ سے سیکھا ہے۔ سعید بن جبیرؒ کی ولادت ۴۵ھ اور وفات ۹۵ھ میں ہوئی، علم وتقویٰ کے اعتبار سے تابعین میں بڑا مرتبہ رکھتے ہیں، قرآن کی تفسیر میں مشہور ہیں، حضرت ابنِ عباسؓ اور حضرت ابنِ عمر رضؓ کے شاگرد ہیں۔

[1] تفصیل کے لئے مناہل العرفان فی علوم القرآن (محمد عبد العظیم زرقانی ص ۱۰۷۔

[2] الاتقان فی علوم القرآن (عربی) جلال الدین سیوطی رح

سبب کے ظاہر کرنے یا بیان کرنے کے مختلف طریقے ہیں، کبھی تو لفظ سبب صاف طور سے ذکر کیا جاتا ہے جیسے (سبب نزول الایۃ کذا) یعنی آیت کے نازل ہونے کا یہ سبب ہے، اس عبارت سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ کہنے والے کا مقصد آیت یا آیتوں کا سبب نزول بتاتا ہے، کبھی لفظ سبب نہیں بولا جاتا بلکہ ایک واقعہ یا حادثہ ذکر کرنے کے بعد (فنزلت) یعنی پھر نازل ہوئی، کہہ دیا جاتا ہے، اور اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے کہ وہ واقعہ یا حادثہ اس آیت یا ان آیتوں کے نازل ہونے کا سبب بنا اس لیے کہ واقعہ بیان کرنے والے نے اسکے ختم ہوتے ہی "فنزلت" کہا، جس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اس کے بعد آیتوں کا نزول ہوا۔[1]

سبب نزول بیان کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کسی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی سوال کیا یا کوئی بات دریافت کی، آپؐ نے وحی نازل ہونے کے بعد اس کا جواب دیا، یہاں نہ لفظ سبب ذکر کیا گیا ہے اور نہ کسی واقعہ کو بیان کرنے کے بعد

---

[1] "ف" حروف عاطفہ میں سے ہے جو ترتیب اور تعقیب کا فائدہ دیتا ہے مثلاً یہ کہا جائے "قام زید فعمرو" تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ پہلے زید کھڑا ہوا اور اسکے بعد عمرو، اسی طرح حرف "ف" سببیت کا بھی فائدہ دیتا ہے جیسے "ضربہ فمات" اس کو مارا پس وہ مرگیا یعنی اس کی موت کی وجہ اور سبب مارنا ہے۔

حرف "ف" کا استعمال ہوا ہے، لیکن صاف طور سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ وہ سوال ہی اس آیت یا آیتوں کے نازل ہونے کا سبب تھا جن کو آپؐ نے پڑھ کر سنایا، جیسے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ[1] سے روایت ہے کہ میں مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہا تھا، آپؐ ایک کھجور کی ٹہنی کے سہارے چل رہے تھے، راستے میں چند یہود کے پاس سے گزرے، تو انھوں نے آپس میں کہا کہ کیا اچھا ہوتا کہ تم ان (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) سے کوئی سوال کرتے، انھوں نے آپؐ سے کہا کہ روح کے متعلق ہم کو بتایئے، آپؐ کچھ دیر کھڑے رہے اور پھر سر اٹھایا، میں سمجھ گیا کہ آپ پر وحی آنے والی ہے، یہاں تک کہ وحی آئی اور آپؐ نے یہ آیت پڑھی:- وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا۔ "اور یہ لوگ آپؐ سے (امتحاناً) روح (کی حقیقت) پوچھتے

---

[1] عن ابن مسعود قال کنت أمشي مع النبي صلى الله عليه وسلم بالمدينة وهو يتوكأ على عسيب فمر بنفر من اليهود فقال بعضهم لو سألتموه۔ فقالوا حدثنا عن الروح فقام ساعة ورفع رأسه فعرفت أنه يوحى اليه حتى صعد الوحي، ثم قال "قل الروح من امر ربي وما اوتيتم من العلم الا قليلا"۔ سورہ بنی اسرائیل پ ۱۵ آیت ۸۵ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۶۰ تفسیر آیت وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ۔

ہیں، آپ جواب میں فرما دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے ہی ہے اور تم کو بہت تھوڑا سا علم دیا گیا ہے۔"

کبھی نہ تو لفظ "سبب" بولا جاتا ہے نہ حرف "ف" کا استعمال ہوتا ہے اور نہ یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ کسی ایسے سوال کے جواب کا انداز اختیار کیا گیا ہے کہ جو سبب نزول بننے کا قرینہ بن سکتا ہو بلکہ کہا جاتا ہے "نزلتْ ھذہ الآیۃُ فی کذا" یعنی یہ آیت اس بارہ میں نازل ہوئی، یہ ایسی عبارت ہے کہ جس سے صاف طور پر یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس سے آیت کا سبب نزول بیان کرنا مقصود ہے۔ سبب نزول بیان کئے جانے کا بھی احتمال ہے اور اس کا بھی کہ اُس آیت میں جو حکم یا احکام بیان کئے گئے ہیں ان کا بتانا مقصود ہے اور ایسی صورت میں کوئی قرینہ ہی دونوں احتمال میں سے کسی ایک کی تعیین کر سکتا ہے یا کسی ایک کو ترجیح دے سکتا ہے۔

اگر ایک ہی موضوع سے متعلق دو عبارتیں ہوں اور ایک تو صاف طور سے آیت یا آیتوں کا سبب نزول بتاتی ہو، لیکن دوسری عبارت سے آیت یا آیتوں کا سبب نزول صاف طور سے معلوم نہ ہوتا ہو۔ تو ایسی صورت میں اُس عبارت کا اعتبار کیا جائے گا کہ جس سے سبب نزول صاف اور واضح طور سے سمجھا جا رہا ہے اور دوسری کے متعلق یہ کہا جائے گا کہ راوی اس سے آیت یا آیتوں کا مطلب یا مفہوم بتانا چاہتا ہے۔

اگر سبب نزول بتانے یا ظاہر کرنے والی دو یا دو سے زیادہ

عبارتوں میں اختلاف ہو، اور ان میں سے کسی سے بھی آیت یا آیتوں کے سبب نزول کا صاف اور کھلے الفاظ میں علم نہ ہو سکے یا سبب نزول کا پتہ نہ چل سکے، مثلاً ایک راوی کہتا ہے " نزلت ھذہ الآیۃ فی کذا " یعنی یہ آیت اس کے بارہ میں نازل ہوئی، دوسرا کہتا ہے " نزلت فی کذا " آیت کا نزول اس کے بارہ میں ہوا ہے۔ اور اپنے قول " اس کے بارہ میں " کی وضاحت کرتے ہوئے جو بات پہلا مفسر یا راوی کہتا ہے دوسرے کی وضاحت یا تفصیل اس سے مختلف ہے، لیکن دونوں کی بتائی ہوئی یا کہی ہوئی باتوں کا جوڑ آیات سے لگ جاتا ہے، یا یہ کہا جائے کہ آیت یا آیتوں کے مضمون سے دونوں کی وضاحت مناسبت رکھتی ہے اور کوئی ایسا قرینہ بھی موجود نہیں ہے کہ جس کی بنا پر یہ کہہ دیا جائے کہ ان میں سے یہ عبارت تو سبب نزول بتا رہی ہے اور دوسری عبارت سے سبب نزول ظاہر نہیں ہوتا۔ علوم القرآن کے ماہرین کہتے ہیں کہ ایسی صورت میں دونوں عبارتوں میں سے کسی کو بھی سبب نزول پر دلالت کرنے والا تسلیم نہیں کیا جائے گا اور یہ کہا جائے گا کہ دونوں کا مقصد آیت کا مدلول اور مفہوم بتانا ہے نہ کہ سبب نزول ظاہر کرنا اور بتانا[1]۔

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مناہل العرفان فی علوم القرآن ص ۱۰۸۔ ۱۰۹

سبب نزول ایک سے زیادہ ہوں اور نازل ہونے والی چیز ایک ہی ہو

اصولِ تفسیر کے علماء کہتے ہیں کہ کبھی راوی ایک ہی مرتبہ نازل ہونے والی آیت یا آیتوں کا سبب نزول ایسی دو روایتوں کے ذریعہ بیان کرتے ہیں کہ جن میں سے ہر ایک روایت سے صاف الفاظ میں جو سبب نزول ظاہر ہوتا ہے وہ دوسری روایت میں بیان کئے ہوئے سبب نزول سے بالکل مختلف ہوتا ہے، یہ ایسی صورت ہے کہ جس میں دونوں روایتیں صاف الفاظ میں سبب نزول ظاہر کرتی ہیں، لیکن چونکہ ہر ایک کا سبب نزول دوسرے سے بالکل مختلف ہے اس لئے مفسرین نے اس کے حل کے لئے یہ تفصیل بیان کی ہے۔

ایسی حالت میں چار صورتیں نکلتی ہیں۔

پہلی[۱] یہ ہے کہ دونوں میں سے یا تو ایک روایت صحیح ہوگی اور دوسری غیر صحیح۔

دوسری[۲] صورت یہ ہے کہ صحیح تو دونوں روایتیں ہوں لیکن ان میں سے ایک کو ترجیح دینے کی وجہ یا قرینہ موجود ہو اور دوسری کو ترجیح دینے کی کوئی وجہ یا قرینہ موجود نہ ہو۔

تیسری[۳] یہ کہ صحیح تو دونوں ہیں، لیکن دونوں میں سے کسی ایک کو دوسری پر ترجیح دینے کے لئے کوئی وجہ یا قرینہ موجود نہیں

ہے، لیکن اسکے باوجود اگر دونوں کو سبب نزول مان لیا جائے تو کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی ہے۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ دونوں روایتیں صحیح ہیں اور ایک کو دوسری پر ترجیح دینے کی کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی، لیکن یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ دونوں کو سبب نزول مان لیا جائے، مذکورہ بالا چار صورتوں میں ہر ایک کے لئے ایک خاص حکم ہے جس کی تفصیل درج ذیل[1] ہے۔

پہلی صورت کہ جس میں ایک روایت صحیح ہے اور دوسری غیر صحیح، اس کا حکم یہ ہے کہ سبب نزول بتانے والی صحیح روایت پر عمل کیا جائے گا اور جو صحیح نہیں ہے اس کا اعتبار نہ ہوگا۔

دوسری صورت کہ جس میں صحیح تو دونوں روایتیں ہیں لیکن دونوں میں سے ایک کو ترجیح دینے کی وجہ یا قرینہ موجود ہے اور دوسری کے لئے کوئی وجہ ترجیح نہیں ہے، اس صورت کا حکم یہ ہے کہ سبب نزول ظاہر کرنے والی اس روایت کو تسلیم کر لیا جائے گا کہ جس کے لئے وجہ ترجیح موجود ہے، دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر اصول حدیث کے معیار پر دونوں کو جانچا

---

[1] اصول تفسیر کی کتب میں ہر صورت کی مثال روایت سے دی گئی ہے، لیکن اختصار کے پیش نظر صرف حکم کے بیان پر اکتفا کیا گیا، یہاں مقصود تفصیل نہیں ہے بلکہ مسائل کی طرف متوجہ کرنا ہے، اس سے قبل بھی مثالیں ترک کر دی گئی ہیں۔

اور پر کھا جائے تو دونوں کے صحیح ہونے کے باوجود صحت کے اعتبار سے ایک کا درجہ دوسری سے کچھ بڑھا ہوا نظر آئے، ایک صحیح ہو تو دوسری واضح ہو، یا یہ کہ ایک روایت کے راوی نے اُس واقعہ یا قصّہ کا خود مشاہدہ کیا ہو کہ جو اس آیت یا ان آیتوں کا سبب نزول بنا، اور دوسری کے راوی نے مشاہدہ نہ کیا ہو، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں سبب نزول ظاہر کرنے والی وہ روایت زیادہ وزنی ہو گی جو زیادہ صحیح ہے یا پھر وہ روایت کہ جس میں راوی نے واقعہ یا قصّہ کا مشاہدہ کیا ہو۔

تیسری صورت یہ ہے کہ صحیح تو دونوں روایتیں مساوی درجہ میں ہوں اور دونوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے کے لئے کوئی وجہ یا قرینہ بھی نہ پایا جاتا ہو، لیکن اگر دونوں کو سبب نزول مان لیا جائے تو کوئی خرابی بھی لازم نہیں آتی، اس صورت میں یہ کہا جائے گا کہ آیت یا آیتوں کا نزول ایسے دو سببوں کے بعد ہوا کہ جن کا زمانہ ایک دوسرے سے بہت ہی قریب تھا، علامہ ابن حجر مکی نے کہا ہے کہ نزول کے سبب ایک سے زائد ہو سکتے ہیں۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ دونوں روایتیں مساوی درجہ میں صحیح ہیں اور ایک کو دوسری پر ترجیح دینے کی کوئی وجہ یا قرینہ بھی نہیں ہے اور دونوں کا سبب نزول ہونا اس لئے ممکن نہیں کہ ان میں زمانہ کے لحاظ سے کافی فاصلہ اور دوری

ہے، اس صورت میں یہ حکم ہوگا کہ آیت یا آیتوں کا نزول ایک سے زائد مرتبہ ہوا، جب بھی سبب پایا گیا نزول ہو گیا اور جو راوی سبب نزول کے وقت موجود تھا اس نے روایت کی اور اسی لئے ایک سے زیادہ روایتیں ہو گئیں اور تکرار نزول میں کوئی حرج نہیں ہے۔

بدرالدین زرکشیؒ لکھتے ہیں۔

وقد ینزّل الشیٔ مرّتین تعظیماً لشانہ وتذکیرًا بہ عند حدوث سببہ خوف نسیانہ وھذا کما قیل فی الفاتحۃ نزلت مرّتین مرّۃً بمکۃ واخریٰ بالمدینۃ[1]	اور کبھی کسی شئ (آیت) کا نزول دو مرتبہ ہوتا ہے اسکی عظمت شان ظاہر کرنے اور بھول جانے کے ڈر سے اس کی یاد دہانی کے لئے جبکہ اس کا سبب نزول (دوبارہ) پایا جائے جیسے کہ سورہ فاتحہ کے متعلق کہا گیا کہ اس کا نزول دو بار ہوا، ایک بار مکہ میں اور دوسری بار مدینہ میں۔

زرکشیؒ نے سورۃ الاخلاص کے متعلق بھی لکھا ہے کہ اس کا نزول ایک بار مکہ میں ہوا اور دوسری بار مدینہ میں ہوا۔ مکہ میں مشرکین کو جواب دینے کے لئے، اور مدینہ[2] میں اہل کتاب کو۔

---

[1] البرھان فی علوم القرآن ج ۱، ص ۲۹

[2] ایضاً ص ۳۰

ابن الحصّار (متوفی ۶۱۱ھ) کہتے ہیں :۔

"کبھی کسی آیت کا نزول بار بار ہوتا ہے، یاد دہانی کے طور پر اور نصیحت کی غرض سے، مثال کے طور پر ابن الحصّار نے سورۃ النحل کی آخری آیتوں اور سورۃ الروم کی شروع کی آیتوں کو پیش کیا ہے اور ابن کثیرؒ نے آیۃ الروح کو مکرر نازل ہونے والی آیتوں میں ذکر کیا ہے۔[1]

نزول کا سبب ایک ہے لیکن آیتیں متعدد نازل ہوئیں

کبھی ایک ہی چیز دو یا دو سے زیادہ آیتوں کے نازل ہونے کا سبب ہوتی ہے اور اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ بات زیادہ واضح ہو جاتی اور سننے والا مطمئن ہو جاتا ہے جیسا کہ حاکم[2] اور ترمذی نے حضرت اُمّ سلمہ رضؓ کی ایک روایت میں بیان کیا ہے کہ جس میں انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے نہیں سنا کہ ہجرت کے سلسلے میں اللہ نے عورتوں کا ذکر کیا ہو، ان کا مطلب یہ تھا کہ ہجرت کرنے والوں میں تو مرد اور عورتیں سب ہی تھے، پھر عورتوں کا

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن (عربی) گیارھویں نوع ص ۴۱

[2] واحدی نے حاکم کے حوالے سے یہ روایت نقل کی ہے۔ اسباب النزول ص ۹۳

کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا، اس پر سورۃ آل عمران[1] کی وہ آیت نازل ہوئی کہ جس میں پہلے تو یہ بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کسی کا عمل بھی خواہ وہ مرد ہو یا عورت اکارت نہیں کرتے، پھر اسی آیت میں ہجرت کرنے والوں اور اللہ کے راستے میں تکلیف اٹھانے والوں (وہ مرد ہوں یا عورتیں) کو خوش خبری دی گئی ہے۔

حاکم (متوفی ۴۰۵ھ) نے دوسری روایت حضرت ام سلمہؓ کی بیان کی ہے، کہ انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپؐ مردوں کا تو ذکر کرتے ہیں لیکن عورتوں کا ذکر نہیں کرتے، عرض کا مقصد اپنی اس آرزو کا ظاہر کرنا تھا کہ قرآن میں مردوں کے ساتھ عورتوں کا بھی ذکر ہوتا تو اچھا تھا، اس پر سورۃ الاحزاب کی وہ آیت نازل ہوئی کہ جس میں کسی قسم کی تفریق کے بغیر اچھے عمل کرنے والے اور پاکباز مردوں اور اچھے عمل کرنے والی اور پاکباز عورتوں کا ذکر کیا گیا ہے اور آخر میں سب کو بخشش اور اجرِ عظیم کی خوش خبری دی گئی ہے[2]۔

---

[1] فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ ج الخ سورۃ آل عمران آیت ۱۹۵

[2] إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ الخ (سورۃ الاحزاب آیت ۳۵ پ ۲۲) حاکم نے اس آیت کے ساتھ إِنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ کے نزول کا بھی ذکر کیا ہے جو سورۃ آل عمران میں ہے۔

حاکم متوفی ۴۰۵ھ نے مستدرک میں حضرت ام سلمہ رضہ کی ایک تیسری روایت کا بھی ذکر کیا ہے جس میں انھوں نے عرض کیا کہ مرد تو جہاد پر جاتے ہیں اور عورتیں جہاد پر نہیں جاتی ہیں، میراث میں بھی ہم کو مردوں کی نسبت سے کم ملتا ہے، تفسیر جلالین کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ام سلمہ رضہ کا مطلب یہ تھا کہ کیا اچھا ہوتا کہ ہم مرد ہوتے تاکہ جہاد کے لئے جاسکتے، اس پر سورۃ النسار کی ایک آیت[۱] نازل ہوئی کہ جس میں بہت دل نشیں انداز میں یہ سمجھا گیا ہے کہ تم کسی ایسی چیز کی تمنا مت کیا کرو جس میں اللہ نے بعض کو بعض پر فضیلت بخشی ہے، مردوں کو آخرت میں ان کے اعمال کا ثواب ملے گا، اور عورتوں کو اُن کے اعمال کا اجرو ثواب ملے گا، اور نجات کا مدار اعمال پر ہے اور اس میں کسی کی تخصیص نہیں ہے، اگر برتری حاصل کرنے کا شوق ہے تو اعمال سے کرو کہ جو فضائل کسبیہ ہیں، ان میں کوشش کرکے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ اجرو ثواب حاصل کرو اور فضائل خاصہ کو جو ہم نے بعض کو بخشے ہیں اور بعض کو نہیں تو تم ان کی تمنا مت کرو۔

---

[۱] وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ الآیۃ سورۃ النسار آیت ۳۲ حاکم نے اس آیت کے ساتھ آیت اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ الآیۃ کے نازل ہونے کا بھی ذکر کیا ہے۔

مذکورہ بالا تینوں روایتیں حضرت ام سلمہؓ[۱] سے ہیں جن پر غور کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ حضرت ام سلمہؓ یہ سمجھنا چاہتی تھیں کہ فضیلت کا جو درجہ مردوں کو حاصل ہے اس سے عورتیں کیوں محروم ہیں، جتنی بار انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق سوال کیا یا اس کو سمجھنا چاہا یا اس کا ذکر کیا تو ہر بار ان کی آپؐ سے گفتگو کسی نہ کسی آیت کے نازل ہونے کا سبب بن گئی اور اس طرح سے متعدد آیتیں نازل ہوئیں جبکہ سبب نزول سب کا ایک ہی تھا۔

اسباب نزول کی معرفت اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ

شاہ ولی اللہ دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ) نے اسباب نزول کے جاننے اور سمجھنے کو ایک دشوار ترین مسئلہ بتایا ہے، ان کے خیال میں اس کی وجہ متقدمین اور متاخرین کی اصطلاحات کا ایک دوسرے سے مختلف ہونا ہے، شاہ صاحبؒ صحابہ کرامؓ اور تابعین کے اقوال کی چھان بین اور غور کرنے کے بعد جس نتیجہ پر پہنچے اس کا حاصل یہ ہے کہ جب وہ لوگ "نزلت فی کذا" (یہ آیت یا آیتیں اس بارہ میں نازل ہوئیں) کہتے ہیں تو ان کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو واقعہ یا قصہ پیش آیا وہی آیت یا آیتوں کے نازل

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مناہل العرفان فی علوم القرآن ص ۱۱۵ - ۱۱۶

ہونے کا سبب بنا، بلکہ وہ لوگ کبھی اس آیت یا ان آیتوں کے کسی ایسے مصداق کو کہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یا آپؐ کے بعد کے زمانہ میں پایا گیا ہو، ذکر کرنے کے بعد " نَزَلَتْ فِی کَذَا " (یہ آیت یا آیتیں اس بارہ میں نازل ہوئیں) کہہ دیتے ہیں، اور ایسی صورت میں اس آیت یا ان آیتوں کا اس واقعہ یا قصہ کے ہر پہلو پر پوری طرح چسپاں یا منطبق ہونا ضروری نہیں ہے، بلکہ اصل حکم میں انطباق کافی سمجھا جائے گا۔

سیوطی رحؒ[1] لکھتے ہیں۔

"زرکشیؒ نے برہان میں لکھا ہے کہ صحابہؓ اور تابعینؒ کی عادت ہے کہ جب وہ کہتے ہیں کہ فلاں آیت فلاں بارہ

---

[1] شیخ جلال الدین عبدالرحمٰن السیوطی رح المتوفی ۹۱۱ھ بہت سی خصوصیات اور خوبیاں ان میں پائی جاتی تھیں، درس و تدریس تصنیف و تالیف، افتاء و قضا، رشد و ہدایت وغیرہ میں ان کو کمال حاصل تھا۔ وہ مشہور اور بلند پایہ مفسر، محدث، فقیہ، مورخ، شاعر، لغوی اور ادیب تھے، شاید ہی کوئی فن ایسا ہو کہ جس پر ان کی کوئی کتاب نہ ہو۔ ان کی تالیفات میں "علوم القرآن" پر "الاتقان فی علوم القرآن" بہت مشہور و مقبول کتاب ہے، جو سیوطی رح نے سینکڑوں کتابوں کے گہرے مطالعہ کے بعد کئی سال کی مدت میں لکھی تھی، علوم القرآن کا کوئی مطالعہ کرنے والا اس کتاب سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔

میں نازل ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ آیت اس حکم پر مشتمل ہے، یہ مطلب نہیں ہوتا کہ بعینہٖ وہ بات اس آیت کے نزول کا سبب ہے۔ یہ گویا اس حکم پر اس آیت سے ایک قسم کا استدلال ہوتا ہے، اس سے مقصود نقل واقعہ نہیں ہوتا۔" میں کہتا ہوں کہ اسباب نزول میں ایک قابل لحاظ چیز یہ بھی ہے کہ ضروری نہیں کہ آیت اُسی زمانہ میں نازل ہوئی ہو جس زمانہ میں واقعہ پیش آیا۔[1]

یہ بھی ہوا ہے کہ صحابہؓ یا کسی صحابیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی سوال کیا یا آپؐ کے زمانہ مبارک میں کوئی حادثہ پیش آیا جس کے متعلق کچھ بتانے کے لئے کسی ایسی آیت سے کہ جو پہلے نازل ہو چکی تھی آپؐ نے حکم کا استنباط کیا، اور اس آیت کی تلاوت بھی فرمائی تو صحابہؓ اور تابعینؒ ایسے مواقع پر "نَزَلَتْ فِي كَذَا" (آیت اس بارہ میں نازل ہوئی) کہہ دیتے ہیں، حالاں کہ وہ آیت اس حادثہ سے پہلے نازل ہو چکی تھی، اور اسی قسم کی خاص صورتوں میں "فَانْزَلَ اللهُ تعالیٰ قولہ کذا" (پھر اللہ نے اپنا یہ قول نازل کیا) یا صرف فَنَزَلَتْ (تو آیت نازل ہوئی) کہہ دیتے ہیں، ان کا یہ

---

[1] مقدمۂ تفسیر نظام القرآن ص ۲۴ (مولانا حمید الدین فراہی) تفصیل کے لئے البرہان فی علوم القرآن ج ۱ ص ۳۱-۳۲ اور الاتقان فی علوم القرآن، نویں نوع (عربی) ص ۳۶

کہنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی آیت سے استنباط یا اُس موقع پر قلب مبارک پر آیت کا القاء بھی وحی کی ایک قسم ہے اور اسی لئے اس صورت میں "فَاُنزِلت" (تو یہ آیت نازل کی گئی) بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ شاہ صاحبؒ کے نزدیک اس کو تکرار نزول سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے، یعنی کسی آیت کا ایک بار سے زیادہ نازل ہونا۔

شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ محدثین قرآن کی آیات بیان کرتے ہوئے اکثر ایسی باتوں کا ذکر کرتے ہیں کہ جن کا درحقیقت اسباب نزول سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، مثلاً صحابہؓ کا کسی مسئلہ پر مناظرہ کرتے ہوئے.... دلیل کے طور پر کسی آیت کا پیش کرنا یا اپنی بات کی وضاحت کے لئے کوئی آیت پڑھ دینا، یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے کلام کے ثبوت میں کسی آیت کا تلاوت کرنا، ان میں سے کسی کو سبب نزول نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح محدثین آیت کے ساتھ کبھی ایسی حدیث کا ذکر کرتے ہیں کہ جو آیت کے مقصد و غرض کے موافق ہوتی ہے، یا اس حدیث سے آیت کے مضمون کی موافقت کی وجہ سے اس آیت کا موقع نزول متعین ہو جاتا ہو، یا آیت میں ایک خاص ڈھنگ سے مبہم انداز میں جن ناموں کا ذکر کیا گیا ہو حدیث سے ان کا تعین ہو جاتا ہو، یا اس میں قرآن کے کسی کلمہ کے ادا کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہو، یا محدثین کی ذکر کی ہوئی اُس حدیث میں قرآن کی ان آیتوں اور سورتوں کے فضائل

بیان کیے گئے ہوں جن کے ساتھ اس حدیث کا ذکر کیا گیا ہے، یا قرآن میں جن باتوں کا حکم دیا گیا ہے ان میں سے کسی ایک کو سامنے رکھ کر حدیث میں یہ بتایا گیا ہو کہ اوامر قرآن پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح عمل کرتے تھے،

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی رائے میں مذکورہ بالا امور میں سے درحقیقت ایک کو بھی سبب نزول نہیں کہا جا سکتا اور نہ مفسرین کے لئے ان کا جاننا ضروری ہے، لیکن مفسر میں دو شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے ایک یہ کہ اس کو ان واقعات کا علم ہو کہ جن کی طرف آیتیں اشارہ کرتی ہوں، ظاہر ہے کہ اس صورت میں جب تک اس واقعہ کا یا قصّہ کا علم نہیں ہوگا آیتوں کا مطلب پورے طور پر سمجھ میں نہیں آسکتا، دوسری چیز کہ جس کا جاننا مفسّر کے لئے ضروری ہے وہ قصّہ ہے کہ جس سے عام کی تخصیص یا کوئی اور فائدہ حاصل ہوتا ہو مثلاً یہ کہ اس قصّہ کے علم کے بعد آیت کو اس کے ظاہری معنی سے پھیرنا ضروری ہو جائے کیونکہ آیت کے اصل مقصد کے جاننے اور سمجھنے کے لئے اس قصہ کو کسی حالت میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، مثلاً آیت وَ لِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ الآیۃ کہ اس کے ظاہری معنی سے سمجھا جاتا ہے کہ نماز پڑھنے والا جس طرف چاہے رُخ کرے اور بیت اللہ کی طرف رُخ کرنا ضروری نہیں ہے، لیکن آیت کے سبب نزول سے واقف ہونے کے بعد کہ جس کا ذکر سبب نزول کے فوائد میں آچکا ہے، یہ سمجھ میں آجائے

گا کہ یہاں آیت کے ظاہری معنی مراد نہیں ہیں۔

قرآن مجید کا نزول رفتہ رفتہ ہوا

قرآن مجید سے پہلے جو آسمانی کتابیں نازل کی گئی تھیں ان کا نزول بتدریج یا رفتہ رفتہ نہیں ہوا، پوری کتاب کا نزول ایک ہی مرتبہ میں ہو جاتا تھا، توریت، انجیل، زبور وغیرہ کا نزول ایک ہی مرتبہ میں[1] ہوا، یہی وجہ ہے کہ عرب کے مشرکین نے اعتراض کیا کہ یہ کیسی آسمانی کتاب ہے کہ جو ایک ہی بار پوری نازل نہیں ہوئی، لیکن جس طرح کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے پیغمبروں کے مقابلہ میں کچھ خصوصیات عطا کی گئیں، اسی طرح قرآن مجید کو حوادث وواقعات اور احکام کی ضرورت کے مطابق رفتہ رفتہ نازل کر کے اس پاک کتاب کو ایک خاص درجہ یا مرتبہ بخشا گیا جو آپؐ کی خصوصیات میں اضافہ کا باعث ہوا۔

کفار مکہ کے اعتراض اور اسکے جواب کو قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان کیا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا	اور کافر لوگ یوں کہتے ہیں کہ ان پر یہ
نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً	قرآن دفعتہ واحدۃ کیوں نہیں اتارا

[1] تفسیر القرآن العظیم للامام الجلیل الحافظ عماد الدین ابی الفدا اسماعیل بن کثیر القرشی الدمشقی المتوفی ۷۷۴ھ، ج ۳ ص ۳۱۷

وَّاحِدَةً ج كَذٰلِكَ ج لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ؁

گیا، اسی طرح (تدریجاً) اس لئے ہے کہ ہم اسکے ذریعہ سے آپؐ کے دل کو قوی رکھیں، اور ہم نے اسکو بہت ٹھہرا ٹھہرا کر اتارا ہے۔

سورۃ الفرقان آیت ۳۲ پ ۱۹

بیان القرآن ج ۸ ص ۲۴

قرآن میں دوسری جگہ ہے۔

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ ؁۲ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ؁

اور قرآن میں ہم نے جا بجا فصل رکھا، تاکہ آپؐ اس کو لوگوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں اور ہم نے اس کو اتارنے میں (حسب واقعات) تدریجاً اتارا۔

سورۃ بنی اسرائیل آیت ۱۰۶ پ ۱۵

بیان القرآن ج ۶ ص ۹۸

مذکورہ بالا دونوں آیتوں میں قرآن مجید کے رفتہ رفتہ نازل کرنے میں جو حکمتیں ہیں ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، پہلی آیت

؁۱ ساتویں صدی ہجری کے مشہور متکلم اور اصولی ابن فورک (محمد بن الحسن بن فورک) لکھتے ہیں کہ توراۃ ایک ہی مرتبہ میں نازل ہوئی کیونکہ اس کا نزول ایک ایسے پیغمبر پر ہوا تھا کہ جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے، یعنی موسیٰ (علیہ السلام)؛ اور قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا، کیونکہ وہ ایسے نبی پر نازل ہوا جو کہ ان پڑھ تھے (مباحث فی علوم القرآن، ڈاکٹر صبحی الصالح ص ۵۵، ۵۶)

؁۲ عَلٰى مُكْثٍ ای مهل و تؤدة لتفهموه جلالین تفسیر سورۃ الاسراء، ص ۲۴۲۔

ہیں بتایا گیا کہ ایک ہی بار میں نازل نہ کرنے میں حکمت و مصلحت یہ ہے کہ وحی الٰہی کا سلسلہ جاری رہنے کی وجہ سے آپؐ کو دلجمعی حاصل ہو گی اور قلب کو تقویت ہو گی اور یہ بھی فائدہ کی بات ہے کہ نازل ہوتا جا رہا ہے اور آپؐ اس کو یاد کرتے جا رہے ہیں، بلکہ دوسروں کو بھی یاد کرا رہے ہیں اور سمجھا رہے ہیں۔ مشرکین و اہل کتاب کے شبہات و اعتراضات کا سلسلہ جاری رہتا تھا جس کی وجہ سے آپؐ کو تکلیف و رنج کا برابر سامنا کرنا پڑتا تھا اور ایسے مواقع پر آپؐ کو وحی الٰہی سے سکون ملتا تھا، حدیثوں سے پتہ چلتا ہے کہ اگر وحی آنے میں کچھ تاخیر ہو جاتی تو آپؐ پریشان ہو جاتے تھے۔

رفتہ رفتہ نزول میں حکمتیں

حکمت الٰہیہ متقاضی تھی کہ آپؐ کی تعلیم کا سلسلہ برابر جاری رہے، مسلسل پیش آنے والے واقعات و حوادث کہ جن کی وجہ سے بعض اوقات نئے نئے مسائل پیدا ہو جاتے تھے ان کو سلجھانے کے لئے بار بار ہدایات ربانی کی ضرورت ہوتی تھی خصوصاً جب کہ شروع شروع میں آپؐ کو ایک ایسی قوم سے واسطہ پڑا کہ جسکی اخلاقی اور سماجی حالت بہت گری ہوئی تھی، اس کی رہبری کی تو ہر ہر قدم پر ضرورت تھی، یہی وجہ ہے کہ تقریباً تیئیس ۲۳ سال کے عرصہ میں قرآن مجید نازل ہوا۔[1]

---

[1] وقد کان تفریق القرآن علی حسب الوقائع (باقی حاشیہ ص ۱۵۸ پر)

قرآن مجید کے رفتہ رفتہ نازل کرنے میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ جہاں مصلحت کا تقاضا ہو تشریع احکام میں ایک معتدل راہ اختیار کی جائے جس کی مثال آئندہ سطور میں آئے گی، سب سے پہلے تو عقائد کی اصلاح سے ان کے دلوں کو کفر و شرک سے پاک کرنے کے بعد نورِ ایمان سے روشن کیا گیا، اللہ اور رسول ؐ کی محبت کا سچا جذبہ پیدا کیا گیا، جزا و سزا یا عقیدۂ قیامت کو بار بار مختلف طریقوں سے ان کو سمجھایا گیا کیونکہ عرب اس عقیدہ کا سختی سے انکار کرتے تھے، عبرت و نصیحت کے لئے گزری ہوئی قوموں کے عروج و زوال سے مؤثر انداز میں ان کو باخبر کیا گیا۔

عقائد کی اصلاح کے ساتھ عبادات کی تعلیم کا آغاز ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مبعوث ہوئے تو توحید کے بعد سب سے پہلا حکم جو آپؐ کو ملا وہ نماز کا تھا، موجودہ طریقہ پر

(بقیہ حاشیہ ص ۱۵۷) والحوادثِ المتجددۃِ والمقتضیاتِ من اول مبعثِ المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم الیٰ قرب انتقالہ إلی الرفیق الاعلیٰ وذلک ثلاث وعشرون سنۃ علی ما ھو الراجح منھا فی مکۃ ثلاث عشرۃ سنۃ وفی المدینۃ بعد الھجرۃِ عشر سنین مع ملاحظۃ التقریبِ فی ھذا التقدیرِ۔

(من کتاب علوم القرآن۔ للشیخ احمد حمد علی ص ۲۳)

نماز، ہجرت سے کچھ پہلے فرض ہوئی[1]، روزہ[2] اور زکوٰۃ[3] مدینہ میں ہجرت کے بعد فرض ہوئے، اور ہجرت کے نویں سال[4] حج[5] فرض کیا گیا۔ فطرت انسانی کو سامنے رکھتے ہوئے خالق فطرت نے قرآن میں یہ بتایا۔

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ — اور اللہ نے تم پر دین میں کسی قسم

۱؎ مکہ میں مسلمانوں کو جو بے اطمینانی اور بے سروسامانی تھی اور جس طرح کفار کے ڈر سے چھپ چھپ کر وہ نماز پڑھتے تھے، اسکے لحاظ سے اس وقت نماز میں زیادہ رکعتیں ہونا ممکن نہ تھا، اسی لئے مکہ معظمہ میں ہر نماز صرف دو رکعتوں کی تھی، جب مدینہ منورہ آکر اطمینان نصیب ہوا تو ظہر، عصر، اور عشاء میں چار چار رکعتیں کردی گئیں، لیکن مسافر کے لئے دو رکعتیں قائم رہیں، کیونکہ اس کی عارضی پریشان حالی باقی رہتی ہے جو اس تخفیف کی علت تھی (سیرۃ النبیؐ، ج ۵، ص ۱۵۹۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ) ۲؎ روزہ ۲ھ میں فرض ہوا (سیرۃ النبی ج ۵ ص ۲۹۴)

۳؎ زکوٰۃ یعنی مطلق مالی خیرات کی ترغیب بھی، ابتدائے اسلام ہی سے شروع ہوئی، لیکن اس کا پورا انتظام آہستہ آہستہ فتح مکہ کے بعد قائم ہوا۔ شروع اسلام میں زکوٰۃ کا لفظ خیرات کا مترادف تھا (سیرۃ النبی ج ۵ ص ۲۰۸ - ۲۰۹) ۴؎ فتح مکہ سے پہلے مسلمان اس سرزمین مقدس میں قدم نہیں رکھ سکتے تھے، اس لئے اس وقت تک حج بھی فرض نہ ہوا۔ (سیرۃ النبی ج ۲ ص ۱۰۰ طبع سوم ۱۳۵۲ھ) ۵؎ ۹ھ میں حج فرض ہوا۔ (سیرۃ النبی ج ۲ ص ۱۲۱، مطبوعہ ۱۳۵۲ھ)

مِنْ حَرَجٍ ط سورۃ الحج آیت ۷۸ — کی تنگی نہیں کی۔

یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ۔ — اللہ تعالیٰ کو تمھارے ساتھ آسانی منظور ہے اور تمھارے ساتھ دشواری منظور نہیں۔

سورۃ البقرہ آیت ۱۰۵

مجبوری اور معذوری کی حالت میں احکام کی بجا آوری میں نرمی اور ڈھیل دی گئی تاکہ دین اسلام کے احکام پر عمل کرنے والا یہ سمجھ لے کہ یہ دین فطرت ہے جس میں خالق کائنات نے اپنی مخلوق کے ساتھ لطف و کرم کا برتاؤ کیا ہے اور فطرت انسانی کو نظر انداز نہیں کیا۔

کچھ اخلاقی اور سماجی برائیاں تو ایسی تھیں کہ جن کو رفتہ رفتہ نہیں بلکہ فوراً ان کو چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا، مثلاً زنا، قتل، چوری اور دوسرے کا مال ناجائز طور پر کھانا، کیونکہ معاشرہ کی اصلاح کے لئے اس قسم کی برائیوں کا فوری طور پر ختم کرنا بہت ضروری تھا اور مہلت کی گنجائش نہ تھی۔

حالات اور مصالح کے پیش نظر بعض برائیوں کو پہلی ہی بار حکم دے کر حرام نہیں کیا بلکہ آہستہ آہستہ چھوڑنے کو کہا گیا۔

یہ بات اس وقت پوری طرح سے سمجھ میں آجائے گی جبکہ ان آیتوں پر غور کیا جائے کہ جو شراب کو حرام کرنے کے سلسلہ میں نازل ہوئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عربوں میں شراب کا جس قدر رواج تھا اس کی مثال ان کی معاصر قوموں میں نہیں ملتی تھی، اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا

کہ وہ ان کی گھٹی میں پڑی تھی اور اس کا قوی اندیشہ تھا کہ اگر ایک ہی مرتبہ یہ حکم دے دیا جاتا کہ اس کو حرام کر دیا گیا ہے اور اس کے قریب بھی نہ جانا تو لوگ پورے طور پر پابندی نہ کرسکیں گے اور قانون کا احترام خطرہ میں پڑ جائے گا جو آئندہ چل کر بہت سی خرابیوں کا باعث بن سکتا ہے۔

اسی لئے قرآن میں پہلے یہ کہا گیا :۔

یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ	لوگ آپؐ سے شراب اور قمار (جوئے)
وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ	کی نسبت دریافت کرتے ہیں۔ آپؐ
كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ	فرما دیجئے کہ ان دونوں میں گناہ کی بڑی
وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ	بڑی باتیں بھی ہیں اور لوگوں کے فائدے
نَّفْعِهِمَا ط الآیۃ	بھی ہیں اور گناہ کی باتیں ان فائدوں
سورۃ البقرہ آیت ۲۱۹ پ۲	سے زیادہ بڑھی ہوئی ہیں (اس لئے دونوں قابل ترک ہیں)

اس آیت سے فوری طور پر شراب اور جوئے کا حرام کر دینا مقصود نہ تھا بلکہ ان دونوں سے پیدا ہونے والی اخلاقی اور سماجی برائیوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اور یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ دونوں میں کچھ فائدے بھی ہیں، لوگوں کو ان کے چھوڑ دینے کے لئے آمادہ کرنا تھا۔

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد جب کچھ لوگوں نے شراب کے نشے میں نماز میں غلطی کی تو یہ آیت نازل ہوئی۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكَارٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ الآية

سورۃ النساء آیت ۴۳ پ ۵

اے ایمان والو تم نماز کے پاس کبھی ایسی حالت میں مت جاؤ کہ تم نشہ میں ہو یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو کہ منھ سے کیا کہتے ہو۔

اس آیت نے یہ پابندی لگادی کہ نماز کے اوقات میں شراب نہ پیا کرو، فجر اور ظہر، عشاء و فجر کی نمازوں کے درمیان تو کافی وقت ہوتا ہے، لیکن ظہر و عصر، عصر و مغرب اور مغرب و عشا کے بیچ میں کم وقت ہوتا ہے اسی لئے لوگ عموماً رات کو پیتے یا فجر کے بعد اور اس طرح سے شراب کچھ کم پی جانے لگی، مصلحت و حکمت بھی یہی تھی کہ لوگ رفتہ رفتہ بالکل چھوڑ دینے کے لئے تیار ہو جائیں۔ اور جب ایسے حالات پیدا ہو گئے تو آخر میں یہ آیت نازل ہوئی:۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ

اے ایمان والو بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بت وغیرہ اور قرعہ کے تیر[سلہ] یہ سب گندی باتیں شیطانی

سلہ اس وقت (زمانہ جاہلیت) میں ایک رسم تھی کہ شرکت میں مثلاً ایک اونٹ خرید کر ذبح کیا، لیکن اسکے گوشت کو کہ جو داموں کی نسبت سے شرکار کا مملوک ہوتا تھا اس نسبت (باقی حاشیہ ص ۱۶۳ پر)

الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ج فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ

سورۃ المائدہ آیت ۹۰۔۹۱ پ

کام ہیں، سو ان سے بالکل الگ رہو تاکہ تم کو فلاح ہو، شیطان تو یوں چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ سے تمہارے آپس میں عداوت اور بغض واقع کردے اور اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نماز سے تم کو باز رکھے۔ سو اب بھی باز آؤ گے۔

مذکورہ بالا آیت کے نازل ہونے کے بعد لوگوں نے شراب قطعاً چھوڑ دی، جن لوگوں کے پاس رکھی تھی انھوں نے پھینک دی اور اس کے برتن بھی توڑ ڈالے۔ حدیثوں میں ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد مدینہ کی گلیوں میں شراب بہنے لگی۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶۲) سے تقسیم نہ کرتے تھے بلکہ دس عدد تیر اسی غرض سے مقرر تھے کہ ان میں سے سات پر کچھ لکیریں بنی تھیں بعض سادہ تھے اور اس کے متعلق کچھ اصطلاح ٹھہرا رکھی تھی، پھر مثلاً ایک کے نام پر اوّل ایک تیر تھیلی میں سے نکالا اور اس اصطلاح کے موافق اس کا جس قدر حصّہ ہوا اتنا گوشت اس کو دے دیا اور اگر اس اصطلاح کے موافق کچھ حصہ نہ ہوا تو محروم کردیا۔ اسی طرح سب ترکار کے واسطے یہی عمل کرتے تھے یہ ایک صورت قمار کی تھی۔ (بیان القرآن ج ۲ ص ۵)

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کو وحی الٰہی کی مسلسل ضرورت

غور کرنے سے سمجھ میں آجائے گا کہ ابتداء نبوت میں آپؐ کو ایسے لوگوں کی اصلاح سپرد کی گئی تھی کہ جو اپنی اصلاح چاہتے ہی نہ تھے اور عرصہ دراز سے اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ جن خوبیوں کے وہ مالک ہیں، دوسری قومیں ان سے محروم ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ کسی کی نصیحت اور اچھی بات کی طرف توجہ نہ کرتے تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ایران، روم و مصر وغیرہ ممالک کہ جو متمدّن کہے جاتے تھے عربوں کا ملک ان سے کافی فاصلہ پر تھا، ان ملکوں میں روحانیت کی روشنی تو نہ تھی لیکن علوم وفنون کا چرچا ضرور تھا، عرب کے تاجر مہینوں کا راستہ طے کر کے ان ملکوں میں مال تجارت لے جاتے اور واپسی پر صرف وہاں سے مال لاتے، لیکن علم و فن کی روشنی وہیں چھوڑ آتے تھے کیونکہ علم وفن کو وہ متاعِ گراں مایہ نہ سمجھتے تھے، ان لوگوں میں لکھنے پڑھنے کا رواج برائے نام تھا اور ملک کی آبادی کے تناسب سے پڑھے لکھے لوگ بہت کم تھے۔ توہم پرستی کا بہت زور تھا، خلافِ عادت اور مافوق الفطرۃ چیزوں سے جلد متاثر ہو جاتے اور ان کے سامنے سر جھکانے کو تیار ہو جاتے

تھے۔ بت پرستی، ستارہ پرستی اور رواج پرستی میں بڑی شدت سے مبتلا تھے۔ ایک خدا کی پرستش کے سوا ہر اس چیز کی پرستش کے لئے تیار ہوجاتے کہ جس میں ان کو کوئی خاص بات نظر آتی، حکومت، ضابطہ اور قانون کا کوئی تصوّر ان کے دل ودماغ میں نہ تھا، طاقتور کمزور پر غالب رہتا تھا۔ قبائلی نظام نے کہ جو صدیوں سے ان میں چلا آرہا تھا ان کو اور زیادہ سرکش بنا دیا تھا۔ ان کو تمام خوبیاں اپنے ہی قبیلہ کے لوگوں میں نظر آتی تھیں، صفائی اور پاکیزگی کا کوئی تصوّر ان کے ذہنوں میں نہ تھا اور برائی کی کوئی قسم ایسی نہ تھی کہ جو ان میں موجود نہ ہو، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان برائیوں کے ساتھ ساتھ ...... مہمان نوازی، شجاعت فیاضی، وعدہ کی پابندی وغیرہ جیسی بعض خوبیاں بھی ان میں موجود تھیں، جن کا معاصر قوموں میں فقدان تھا، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کا نام تو عقیدت سے لیتے لیکن اس سے بے خبر تھے کہ ان کی صحیح دینی تعلیمات اور ہدایات کیا تھیں۔

مدینہ کی ہجرت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم اور عام مسلمانوں کا کہ جن کو اسلام قبول کئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا، یہودیوں اور عیسائیوں سے واسطہ پڑا۔ یہودی، عیسائی اور ان کے مذہبی پیشوا کہ جن کو قرآن میں بار بار اہل کتاب کہہ کر خطاب کیا گیا ہے اپنا اثر جانے کے

لیے مسلمانوں کو بنی اسرائیل کے پیغمبروں کی کہانیاں سنانے کہ جن میں سے زیادہ تر بے سند ہوتی تھیں اور اس سے ان کا مقصد مسلمانوں کے عقائد کو کمزور کرنا تھا، توریت و انجیل میں جو محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بتایا گیا تھا اس کو چھپاتے اور طرح طرح کی من گھڑت تاویلیں کرتے تھے۔ کیونکہ آپؐ کی بعثت سے ان کا اقتدار اور رسوخ کم ہو رہا تھا وہ اپنے علم و ذہانت سے کام لے کر مسلمانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات ڈالنے کی کوشش کرتے اور کبھی خود بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر طرح طرح کے سوالات کرتے، جس کا مقصد شر و فساد پیدا کرنا اور آپؐ کا امتحان لینا ہوتا اور یہ بھی کہ لوگ آپؐ سے بدظن ہو جائیں اور آپؐ کی طرف توجہ نہ کریں۔

مکہ کے مقابلہ میں مدینہ میں اسلام زیادہ تیزی سے پھیل رہا تھا، یہ بات ان کو بہت پریشان کر رہی تھی اور ان کی سازشیں یہاں تک بڑھیں کہ جنگوں تک نوبت آگئی اور سازشوں کا سلسلہ برابر بڑھتا رہا جن کا پردہ قرآن میں چاک کر دیا جاتا تھا تاکہ آپؐ ان سے باخبر رہیں اور ان کو ناکام بنانے کی تدابیر کرتے رہیں۔ ساتھ ساتھ آپؐ کو یہ اطمینان بھی دلایا جاتا کہ آخر میں کامیابی کا سہرا آپؐ کے سر رہے گا اور یہ لوگ ذلیل و رسوا ہو کر رہیں گے۔

مذکورہ بالا حالات میں یہ بہت ضروری تھا کہ مسلسل

بذریعہ وحی آپؐ کی زندگی کے آخری لمحات تک آپؐ کو نشیب و فراز سے باخبر رکھا جائے اور عرب سماج میں جو برائیاں تھیں ان کو آہستہ آہستہ اخلاقی تعلیمات اور دینی احکام کے ذریعہ ختم کیا جائے۔ اس لئے کہ ایسے حالات میں تربیت کا صحیح طریقہ یہی ہوتا ہے کہ برائیاں رفتہ رفتہ ختم کی جائیں اور ان کی جگہ اچھائیاں دل و دماغ میں جگہ پیدا کر لیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملک و قوم کے حالات اور ان کی مصالح کے پیشِ نظر قرآنِ کریم لمبی مدت تک رفتہ رفتہ نازل ہوتا رہا۔

عربوں کو اپنی زبان دانی پر غرور و گھمنڈ تھا، اس کے پیشِ نظر بہتر و مناسب یہی تھا کہ قرآن کا نزول رفتہ رفتہ ہوتا کہ ہر بار ان کو اس کا احساس ہو جائے کہ اس کتاب کے مختلف مضامین کو جس ڈھنگ سے ادا کیا گیا ہے ہم اہلِ زبان ہونے کے باوجود ان کو اس سلیقہ و ڈھنگ سے ادا نہیں کر سکتے جس کی طرف ہم کو بار بار دعوت مقابلہ دی جا رہی ہے، ان کو یہ بات اور زیادہ حیرت و تعجب میں ڈال رہی تھی کہ مختلف اوقات اور گوناگوں حالات میں نازل ہونے کے باوجود اس کتاب کے مضامین کا تسلسل باقی ہے اور اس کی روانی میں کسی قسم کا فرق نظر نہیں آتا اور یہ دیکھ کر ان میں سے کچھ لوگ سوچنے پر مجبور ہو جاتے کہ یہ کسی انسان کا

کلام نہیں معلوم ہوتا ہے۔

نزولِ قرآن کی اس لمبی مدت میں بہت سے واقعات کا پیش آنا ایک فطری بات تھی جن میں ایسے واقعات بھی ہوتے کہ جو تبلیغی کاموں میں رکاوٹ پیدا کرنے کے لیے جان بوجھ کر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کی توجہ کا مرکز بنائے جاتے اور کچھ حالات کے تحت پیش آتے تھے، جن کا طے کرنا اور سلجھانا مذہبی اور سماجی نقطۂ نظر سے آپؐ کے لئے بہت ضروری تھا ورنہ دوسری خرابیوں کے پیدا ہو جانے کا خطرہ باقی رہتا اور اس کے لئے وحیِ الٰہی کی ہدایت کی آپؐ کو ہر لمحہ ضرورت تھی اور ضرورت پڑنے پر قرآن کی ہدایات کے مطابق وہ باتیں طے کر دی جاتی تھیں۔

باب سوم

محکم اور متشابہ

باب سوم —— محکم ومتشابہ

محکم اور متشابہ

اللہ تعالیٰ نے محمد صلّی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے نازل فرمایا اور اپنے فضل و کرم سے اس میں دین کی ضروری باتیں آسان انداز میں بیان کر دیں تاکہ ان کو اپنے عقائد و اعمال درست کرنے میں کسی قسم کی دشواری نہ ہو۔ آسمانی کتابوں میں عام طور پر تفصیل نہیں ہوتی، ان میں اصول ہوتے ہیں اور جہاں ضروری ہوتا ہے تفصیل کر دی جاتی ہے۔ رسول اپنے قول و عمل سے اللہ کی کتاب کو سمجھاتا اور اپنی عملی زندگی لوگوں کے سامنے نمونہ کے طور پر پیش کرتا ہے۔

قرآن مجید میں ہے۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ	اور ہم نے اتارا ہے آپ پر ذکر (قرآن)
لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ	تاکہ آپ اچھی طرح سمجھا دیں لوگوں
اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ	کو جو اتارا گیا ہے ان کے لئے اور
سورۃ النحل آیت ۴۴ پ ۱۴	اس لئے کہ وہ (کبھی) ان باتوں کو) سوچیں۔

دین کے احکام اور بنیادی باتیں جن آیتوں میں بیان کی جاتی ہیں وہی اصل کتاب ہیں جن کو مُحکمات کہا گیا ہے ان میں اختلاف نہیں ہوتا، کوئی شخص خود ہی نہ سمجھنا

چاہتا ہو اور کج بحثی کرنے لگے تو اس کا کوئی علاج نہیں۔
اس میں شک نہیں کہ قرآن میں جا بجا ان کو ایسے ڈھنگ سے بیان کیا گیا ہے کہ جن میں بظاہر کہیں کہیں الفاظ اور عبارتوں کا اختلاف نظر آتا ہے، لیکن ذرا غور کیا جائے تو سمجھ میں آ جائے گا کہ معنی و مقصد کے لحاظ سے ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ ایک ہی بات کو ذہن نشین کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے یہ بتا دیا گیا کہ اگر کوئی کج فہمی کم فہمی یا کسی اور وجہ سے اس کتاب میں غور کرنے کی بجائے اختلافات پیدا کرنے لگے تو آپؐ اس کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہیں اور اس سے زیادہ آپؐ پر فرض نہیں ہے۔

وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ	اور ہم نے آپؐ پر یہ کتاب صرف اس واسطے نازل کی ہے کہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں ان کو آپؐ اچھی طرح سمجھا دیں اور ایمان والوں کی ہدایت اور رحمت کی غرض سے نازل کی ہے۔

سورۃ النحل آیت ۶۴ پ۱۴

قرآن مجید میں کچھ آیتیں ایسی بھی ہیں کہ جن کا مطلب ظاہر نہیں ہے ان کو متشابہات کہا گیا ہے۔ اصحاب بصیرت ان کو محکمات کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں

اور اس سے ان کے پختہ عقیدہ میں کوئی فرق نہیں آتا، لیکن جن کے دلوں میں ٹیڑھ اور طبیعتوں میں کجی ہے وہ دین میں فتنے پیدا کرنے کی غرض سے ان میں طرح طرح کی تاویلیں کرتے ہیں، محکم اور متشابہ کا مطلب ذیل میں لکھی ہوئی آیت کی تفسیر سے سمجھ میں آجائے گا۔

هُوَ الَّذِیٓ اَنْزَلَ	وہ (اللہ تعالیٰ) ایسا ہے کہ جس نے
عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ	نازل کیا تم پر کتاب کو، جس میں کا ایک حصہ
اٰيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ	وہ آیتیں ہیں جو کہ اشتباہ مراد سے محفوظ
هُنَّ اُمُّ الْكِتَابِ ۱	ہیں (ان کا مطلب ظاہر ہے) اور یہی
وَاُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ	آیتیں اصل مدار ہیں (اس) کتاب
فَاَمَّا الَّذِيْنَ	(قرآن) کا اور دوسری آیتیں ایسی ہیں
فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ ۲	کہ جو مشتبہ المراد ہیں (ان کا مطلب ظاہر
فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ	نہیں ہے) تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی
مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ	ہے وہ اس کے اسی حصے کے پیچھے ہو لیتے

---

۱ بقوله فی المحکمات (هُنَّ اُمُّ الکتاب) یدل انها المعظم والجمهور وامّ الشیٔ معظمه وعامته کما قالوا امّ الطریق بمعنی معظمه وامّ الدّماغ بمعنی الجلدة الحاویة له الجامعة لاجزائه ونواحیه ۔ الموافقات للشاطبی ج ۳ ص ۸۶

۲ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ الآیة ۔ ای ضلال وخروج عن الحق الی الباطل ابن کثیر ج ۱ ص ۳۴۵

وَابْتِغَاءَ تَاوِيلِهٖ ج
وَمَا يَعْلَمُ تَاوِيلَهٗ
اِلَّا اللّٰهُ وَالرَّاسِخُونَ
فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ
اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ
عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا
يَذَّكَّرُ اِلَّا اُولُوا
الْاَلْبَابِ

سورۃ آل عمران آیت ۷
پ ۳

ہیں جو کہ مشتبہ المراد ہے (دین میں) فتنہ چاہنے کی غرض سے اور اس (مشتبہ المراد) کا (غلط) مطلب تلاش کرنے کی غرض سے (تا کہ اس کو صحیح کہکر اپنے غلط عقیدہ میں مدد حاصل کریں) حالاں کہ اس کا (صحیح) مطلب بجز حق تعالیٰ کے کوئی اور نہیں جانتا (لیکن اگر اللہ صراحۃً یا اشارۃً کسی کو بتادے تو اس کو بھی خبر ہو سکتی ہے) اور جو لوگ علم (دین) میں پختہ کار (فہیم) ہیں وہ (ایسی آیتوں کے متعلق) یہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر (اجمالاً) یقین رکھتے ہیں کہ سب (آیتیں کہ جن کے معنی ظاہر ہیں اور جن کے نہیں) ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو کہ اہل عقل ہیں۔

اس آیت میں محکمات کو اُمّ الکتاب کہا گیا ہے، عربی زبان میں اُمّ کے معنی بڑے کے آتے ہیں۔ اُمّ الطّریق وہ بڑا راستہ ہے کہ جس سے چھوٹے چھوٹے راستے نکلتے ہیں۔ اُمّ کے معنی اصل کے بھی آتے ہیں، مکہ کو اُمّ القریٰ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ زمین کا مرکزی نقطہ اور اصل بھی ہے، یہیں سے زمین اطراف و جوانب میں پھیلائی گئی۔

سورۃ الفاتحہ کو بھی اُمّ الکتاب اسی لیئے کہا جاتا ہے کہ وہ قرآن کے اصول پر حاوی ہے اور ان کی اصل ہے لفظ اُمّ سے اصل معنی کے ساتھ اس کا مرجع اور مرکز ہونا بھی سمجھ میں آتا ہے، ماں کو عربی میں اسی لیئے اُمّ کہا جاتا ہے کہ وہ اولاد کی اصل اور ضرورت کے وقت ان کا مرجع ہوتی ہے [1]

آیات مُحکمات کے اُمّ الکتاب ہونے کا مطلب

آیات محکمات کے اُمّ الکتاب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ قرآن کی اصل اور اس کا بڑا حصہ ہیں، قرآن کا وہ حصہ کہ جس کو متشابہات کہا جاتا ہے ان کی نسبت سے کم ہے، اس کا مرجع اور مرکز محکمات ہیں، جب ان میں کوئی دشواری یا الجھاؤ پیش آئے گا تو محکمات کی طرف رجوع کرکے ان کو حل کر لیا جائے گا کیونکہ وہ اصل ہیں [2] اور صاف زبان

---

[1] تاج العروس فصل الھمزۃ من باب المیم ج ۸ (للامام اللغوی محب الدین ابی الفیض السید محمد مرتضیٰ الحسینی الزبیدی الحنفی)

[2] وقال ابن الحصار قسّم اللّٰہ ایات القرآن الی محکم ومتشابہ واخبر عن المحکمات انہا اُمّ الکتاب لان الیہ تُرَدُّ المتشابہات (الاتقان ص۲۳۱ نوع ۴۳)

ہیں بیان کی گئی ہیں جن کے مفہوم و معانی میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں ہے اور جن میں تاویلات کی گنجائش نہیں ہے ان کے الفاظ و معانی سے وہ مقصد صاف طور سے سمجھ میں آجاتا ہے جس کے لئے نازل کی گئی ہیں، اسلام کے بنیادی اصول عبرت و نصیحت اور گمراہیوں سے بچنے کی ان میں بار بار تاکید کی گئی ہے، ایک سچے دین کی طرف انسانوں کو بڑے موثر اور اچھے انداز میں بلایا گیا ہے، عبادات اخلاق، اوامر و نواہی وغیرہ ان سب کو محکمات میں بڑے سلیقہ سے سمو دیا گیا ہے تاکہ سچائی کی تلاش کرنے والا اپنا راستہ آسانی سے اختیار کر سکے ان ہی کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے رکھے اور گمراہیوں سے بچا رہے، لیکن متشابہات میں اشتباہ ہوتا ہے جو سمجھنے والوں کے علم و فہم میں کمی اور بیشی ہونے کی وجہ سے کم اور زیادہ ہو سکتا ہے، اور کہیں اس لئے اشتباہ ہوتا ہے کہ متشابہات میں بعض ایسی چیزیں بتائی گئی ہیں کہ جن کے سمجھنے سے انسان کے حواس عاجز و قاصر ہیں نہ صرف حواس بلکہ انسان کا علم اور عقل دونوں بے بس ہو جاتے ہیں، اس لئے کہ جن چیزوں کو انسان نے نہ کبھی دیکھا نہ چکھا اور نہ چھوا ان کو پوری طرح سے کیسے سمجھا یا جائے، اس مقصد کے لئے جو الفاظ بھی ہوں گے وہ اس کے لئے غیر مانوس ہوں گے، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اس قسم کی باتوں اور چیزوں کو سمجھانے کے لئے وہ الفاظ استعمال کئے جائیں کہ جن کو انسان ان چیزوں سے کچھ

مناسبت اور مشابہت رکھنے والی چیزوں کے لئے استعمال کرتا ہے تاکہ اس کو ان حقائق کا ایک دھندلا سا تصوّر ہو جائے۔

اس کے علاوہ محکمات اور متشابہات کی اس تقسیم سے کج فہم اور خام علم رکھنے والوں اور سلیم الطبع اور پختہ علم و ایمان رکھنے والوں کی جانچ اور آزمائش بھی ہو جاتی ہے، کج فہم اور خام علم والے تو قرآن کے اس حصہ کو جو صاف اور واضح ہے متشابہات کی طرح عمل کئے بغیر چھوڑ دیتے ہیں اور متشابہات پر بحث کرتے، ان کی تاویلیں کرتے، ان میں طرح طرح کی باریکیاں پیدا کرتے ہیں، اور ان کا مطلب سمجھنے کے لئے محکمات کی طرف رجوع نہیں کرتے، اس لئے کہ ان کا مقصد عمل نہیں ہے، وہ جس قدر غور کرتے ہیں کج فہمی کی وجہ سے اسی قدر مقصد سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں، برخلاف اس کے طالب حق اور پختہ ایمان والوں کو محکمات پر غور کرنے کی وجہ سے چونکہ یقین ہو جاتا ہے کہ یہ اللہ کی کتاب ہے تو پھر متشابہات ان کے دلوں میں کوئی الجھاؤ پیدا نہیں کرتے وہ جتنا سمجھ لیتے ہیں اسی پر قناعت کر لیتے ہیں اور جو ان کی سمجھ میں نہیں آتا اپنی کوتاہی فہم کا اقرار کرتے ہوئے اس پر ایمان لے آتے ہیں اور من مانی تاویل نہیں کرتے۔

متشابہ کے بارہ میں خطّابی کی رائے

خطابیؒ[1] کہتے ہیں متشابہ کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ کہ اگر اس کو محکم کی طرف پھیر کر اور اس کے ساتھ ملا کر غور کیا جائے تو اس متشابہ کے معنی سمجھ میں آجائیں، اور دوسری قسم وہ ہے کہ اس کی حقیقت تک پہنچنے کا کوئی طریقہ اور ذریعہ نہ ہو، کج فہم لوگوں کا شیوہ اسی قسم کے متشابہ کے پیچھے پڑے رہنا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دھوکہ اور فتنہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

محکم اور متشابہ کی تعریف

محکم لغت کے اعتبار سے "حُکْمٌ" سے بنا ہے جس کے معنی ہیں روکنا یا روک دینا، کہا جاتا ہے حَکَمْتُ عَلَيْهِ بِكَذَا یعنی میں نے اس کو اپنی مرضی کے خلاف کرنے سے روک دیا۔ اسی طرح کہا جاتا ہے حَکَمْتُ بَيْنَ الْقَوْمِ یعنی میں نے لوگوں کے کسی جھگڑے وغیرہ کا فیصلہ کر دیا۔ اسی لئے فیصلہ کرنے والے کو حاکم اور حَکَمْ کہا جاتا ہے

---

[1] حمد بن محمد بن ابراہیم بن الخطّاب ابوسلیمان البستی وفات ۳۸۸ھ، الاعلام ج ۲ ص ۳۰۴

کیونکہ حاکم اپنے فیصلے سے کسی ایک فریق پر ظلم ہونے سے روکتا ہے اور لغت میں حَکَمٌ فیصلہ نافذ کرنے والے کو بھی کہتے ہیں حَکَمَۃُ الْفَرَسُ گھوڑے کی لگام کے ساتھ بندھے ہوئے اس حصہ کو بھی کہتے ہیں جو گھوڑے کے منہ میں ہوتا ہے تاکہ گھوڑا قابو میں رہے اور سرکشی نہ کرسکے، حِکْمَۃ یعنی دانائی کی بات کو حِکْمَۃ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اس پر چلنے والے کو غیر مناسب کاموں اور باتوں سے روکتی ہے۔ کہا جاتا ہے اَحْکَمْتُ الشَّیْءَ یعنی میں نے کسی چیز کو مضبوط کر دیا۔ آیات محکمات ان آیتوں کو کہا جاتا ہے کہ جو اپنی جگہ مضبوطی سے قائم اور جمی ہوئی رہتی ہیں۔

سورۃ ہود میں ہے۔

کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ[1] — یہ ایک ایسی کتاب ہے کہ اسکی آیتیں محکم ہیں

ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ — پھر صاف صاف بیان کی گئی ہیں ایک

---

[1] والآیات المُحکمَاتُ ھی (قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّکُمْ عَلَیْکُمْ) الی اٰخر السورۃ أو) ھی (الَّتِی اُحکمت فلا یحتاج سامعُھا الی تاویلھا لبیانھا کاقاصیص الانبیاء) وقیل ھوما لم یکن متشابھاً لانہ احکم بیانہ بنفسہ ولم یفتقر الی غیرہ۔

تاج العروس فصل الحاء من باب المیم ج ۸

حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۔   حکیم باخبر کی طرف سے ۔

سورۃ ہود آیت ۱ پ ۱۱

بیان القرآن ج ۵ ص ۲۵

حافظ عماد الدین ابن کثیر نے لفظ اُحْكِمَتْ اور فُصِّلَتْ کے یہ معنی بیان کئے ہیں۔ ای ھی محکمۃٌ فی لفظھا مفصلۃ فی معناھا فھو کامل صورۃً و معنیً[1]، اس کی آیتیں الفاظ کے لحاظ سے محکم اور معنی کے لحاظ سے مفصّل ہیں اس لئے قرآن ظاہری اور باطنی دونوں اعتبار سے کامل ہے۔

مُتَشَابِه[2]، شِبْہٌ یا شَبَہٌ سے بنا ہے جس کے معنی مثل کے ہیں، شِبْہٌ کے معنی مشابہت کے بھی آتے ہیں۔ کہا جاتا ہے شَابَهَهٗ واَشْبَهَهٗ جب کہ ایک چیز دوسری کے مثل ہو، اور تَشَابَهَا وَاشْتَبَهَا اس وقت بولا جاتا ہے جب کہ دو چیزیں ایک دوسرے سے بہت زیادہ مشابہت رکھتی ہوں کہ ان کا پہچاننا مشکل ہو جائے جیسا کہ سورۃ الأنعام میں ہے مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ اللہ تعالیٰ نے مختلف قسم کے پھلوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ان میں سے بعض ایک دوسرے سے ملتے جلتے اور بعض ملتے جلتے نہیں ہیں۔

سورۃ الزمر میں ہے۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا   اللہ نے بڑا عمدہ کلام نازل فرمایا ہے جو ایسی کتاب ہے کہ باہم ملتی جلتی ہے

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۴۳۵   [2] والمتشابہ۔ فالمحکم فلا مرّ ربانی ص ۱۸۲ (بقیہ)

مُتَشَابِهًا مَّثَانِيَ — باربار دہرائی گئی ہے۔

سورۃ الزمر آیت ۲۳ پ ۲۳

سورۃ البقرۃ میں ہے۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ

آیت ۷۰

کہنے لگے کہ (اب کی بار اور) ہماری خاطر سے اپنے رب سے دریافت کر دیجئے کہ ہم سے بیان کر دیں کہ اس کے اوصاف کیا کیا ہوں کیونکہ ہم کو اس بیل میں (قدرے) اشتباہ ہے اور ہم ضرور انشاء اللہ تعالیٰ (اب کی بار) ٹھیک سمجھ جائیں گے۔

مذکورہ بالا آیتوں کے علاوہ قرآن مجید میں متعدد جگہ شِبْہٌ سے بنے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، جن میں ایک چیز کے دوسری چیز کے مشابہ ہونے، دوسرے کے مثل ہونے یا دو چیزوں کے اس طرح سے ہونے کا کہ ان میں التباس اور اشتباہ کی وجہ سے فرق و تمییز مشکل

(باقی حاشیہ ص ۱۸۱) تفسیره والمتشابه ما لم يُتَلَقَّ معناه من لفظه وهو على ضربين احدهما اذا رُدَّ الى المحكم عُرِفَ معناه والآخر ما لا سبيل الى معرفة حقيقته فالمتبع له مبتغٍ للفتنة لانه لا يكاد ينتهي الى شيء تسكن نفسه اليه

تاج العروس ج ۹ فصل الشین، ن باب الهاء

ہو جائے مفہوم پایا جاتا ہے۔

محکم اور متشابہ کے لغوی معنی کی مناسبت سے سورۃ ہود، سورۃ الانعام سورۃ الزمر اور سورۃ البقرہ کی آیتیں ضمناً ذکر کردی گئی ہیں، یہاں اصل مقصود سورۃ آل عمران کی وہ آیت ہے کہ جن پر محکم اور متشابہ کی وضاحت کے لئے مزید غور ضروری ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ نے آیت هُوَ الَّذِىٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ اٰيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتَابِ وَاُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ سے اپنی کتاب الاتقان میں محکم اور متشابہ کی بحث شروع کرنے کے بعد لکھا ہے کہ "ابن حبیب نیشاپوری متوفی ۳۳۲ھ نے اس مسئلہ میں تین قول ذکر کئے ہیں۔

(۱) اللہ کے قول كِتَابٌ اُحْكِمَتْ اٰيَاتُهٗ کے لحاظ سے پورا قرآن محکم ہے۔

(۲) اللہ کے قول كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ کے مفہوم کے پیش نظر پورا قرآن متشابہ ہے۔

(۳) تیسرا اور صحیح قول یہ ہے کہ آیت هُوَ الَّذِىٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ الآیۃ کے مطابق قرآن کی آیتوں میں محکمات بھی ہیں اور متشابہات بھی۔ پہلے قول میں جو آیت پورے قرآن کے محکم ہونے پر دلیل کے طور پر پیش کی گئی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں محکم (مضبوط و استوار)

ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسکی آیات میں نقص اور اختلاف نہیں پایا جاتا۔ دوسرے قول میں جو کتاب (قرآن) کو متشابہ کہا گیا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن کی آیتیں حق وصداقت اور اعجاز میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں[1]"

آیت مذکورہ میں محکم کو متشابہ کے مقابل ذکر کیا گیا ہے جس طرح کہ "راسخون فی العلم" (پختہ علم والوں) کو "اَلَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ" جن کے دلوں میں کجی ہے) کے مقابل ذکر کیا گیا ہے، اور اس تقابل[2] کی وجہ سے

---

[1] ماخوذ از الاتقان (عربی) تینتالیسویں نوع ص ۲۲۸۔ ہو سکتا ہے کہ ابن حبیب نیشا پوری کا پہلا اور دوسرا قول محکم اور متشابہ کے لغوی معنی کے اعتبار سے ہو جیسا کہ بعض دوسرے علماء نے بھی کہا ہے کہ پورا قرآن اپنی بہترین ترتیب اور الفاظ کے جماؤ کے اعتبار سے محکم ہے اور پورے قرآن کے متشابہ ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ اس کی آیتیں فصاحت و بلاغت اور اعجاز میں ایک دوسرے سے اس قدر ملتی جلتی ہیں کہ یہ فیصلہ مشکل ہو جاتا ہے کہ کون سی آیت دوسری سے بڑھی ہوئی ہے۔

[2] من الواضح فی هذه الآیة انّ المحکم یقابل المتشابه، کما انّ الراسخین فی العلم یقابلون الذین فی قلوبهم زیغ، وقد حمل هذا التقابل العلماء علی تعریف کل من المحکم والمتشابه فکثرت آراءهم (باقی حاشیہ ص ۱۸۵ پر)

علماء نے محکم اور متشابہ کی تعریف کی طرف توجہ کی جس میں ان کے اقوال ایک دوسرے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں، سیوطی نے "الاتقان فی علوم القرآن" میں چودہ[1] اقوال بیان کئے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں۔

محکم[2] اس کو کہتے ہیں کہ واضح اور ظاہر ہونے کی وجہ سے سمجھ میں آجائے یا تاویل سے اس کا مطلب سمجھ میں آجائے، اور متشابہ وہ ہے کہ جس کا علم اللہ نے اپنے لئے خاص کر لیا ہو جیسے قیامت کا آنا، دجّال کا نکلنا اور قرآن مجید کی

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۴) فی ھذا الموضوع و تعددت وجھات نظرھم ولکن آراؤھم تؤول فی النھایۃ الی انّ المحکم ھو الذی یدل علی معناہ بوضوح لا خفاء فیہ والمتشابہ ھو الذی یخلو من الدّلالۃ الراجحۃ علی معناہ فیدخل فی المحکم النص والظاہر اما النص فلانہ اللفظ الّذی وضع للمعنی الراجح المتبادر ویدخل فی المتشابہ المجمل والمؤوّل والمشکل لانّ المجمل یحتاج الی تفصیل والموول لا یدل علی معنی الا بعد التاویل والمشکل خفی الدلالۃ، فیہ لبس وایہام - مباحث فی علوم القرآن ص ۲۸۲، ڈاکٹر صبحی الصالح

[1] ان چودہ اقوال میں سب ایسے نہیں ہیں کہ جن میں محکم اور متشابہ کی تعریف بیان کی گئی ہے، کچھ اقوال میں تعریف ہے اور کچھ اقوال میں محکم اور متشابہ کا مصداق بیان کیا گیا ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تینتالیسویں نوع الاتقان۔

جن سورتوں میں حروف مقطعات آئے ہیں ان کے معنی کا علم۔

محکم[۲] اس کو کہتے ہیں کہ جس کے معنی صاف اور واضح ہوں، اور متشابہ اس کو کہتے ہیں کہ جس کے معنی صاف اور واضح نہ ہوں۔

محکم[۳] وہ ہے کہ جس کی صرف ایک تاویل ہو سکے اور دوسری کا احتمال نہ ہو اور متشابہ وہ ہے کہ جس میں کئی تاویلوں کا احتمال ہو۔

محکم[۴] وہ ہے کہ جو اپنے مفہوم (معنی) میں مستقل ہو اور بیان کا محتاج نہ ہو، اور متشابہ وہ ہے کہ جو اپنے معنی پر دلالت کرنے میں مستقل نہ ہو اور دوسرے کے ساتھ ملانے کے بعد اس کے معنی سمجھ میں آسکیں۔

محکم[۵] وہ ہے کہ جس طرح نازل ہوا ہے اسی حال پر رہتے ہوئے کسی تاویل کے بغیر سمجھ میں آجائے اور متشابہ وہ ہے کہ جس کے سمجھنے کے لئے تاویل کی ضرورت پڑے۔

محکمات[۶] وہ آیتیں ہیں جن میں حلال و حرام کا بیان ہے اور ان کے سوا قرآن کا جو حصہ ہے اس کو متشابہ کہا جائے گا۔ کیونکہ اس حصے کے مضامین ایک دوسرے سے ملتے جلتے اور متشابہ ہیں بلکہ ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں۔

محکم اور متشابہ کی تعریف میں جو اقوال ذکر کئے گئے ہیں

اُن پر غور کرنے سے واضح ہو جائے گا کہ ان میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے اور ان میں سے مشہور ترین قول یہ ہے کہ محکم وہ ہے کہ جس کے معنیٰ صاف اور واضح ہوں یا واضح طور پر اپنے معنیٰ پر دلالت کرتا ہو اور متشابہ اس کو کہتے ہیں کہ جس کے معنیٰ صاف نہ ہوں یا واضح طور پر اپنے معنیٰ پر دلالت نہ کرتا ہو۔ اس قول کی مزید تشریح ذیل میں درج کی جاتی ہے جس کو ترجمان السنۃ میں بیان کیا گیا ہے۔

"محکم کے دو معنیٰ ہیں ایک عام اور ایک خاص۔ خاص اصطلاح میں محکم منسوخ کے بالمقابل مستعمل ہوتا ہے، اس بنا پر قرآن کی جو آیات منسوخ نہیں ہیں وہ سب محکمات کہلائیں گی، اور جو منسوخ ہیں ان کو متشابہات کہا جائے گا۔ محکم کے عام معنیٰ یہ ہیں کہ جو آیات اپنی مراد میں واضح اور کھلی ہوئی ہیں وہ محکمات ہیں، اس اصطلاح کے موافق متشابہات وہ آیات ہوں گی جو اپنی مراد میں واضح نہ ہوں خواہ بحث و تمحیص کے بعد حل ہو سکیں یا نہ ہو سکیں، اس بنا پر متشابہات کی دو قسمیں ہو جائیں گی۔

(۱) حقیقی

(۲) اضافی

متشابہ حقیقی وہ ہوگا جس کی مراد نہ خود شریعت نے بتلائی ہو اور نہ اسکے حاصل کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ ہو

یعنی تحقیقات کے تمام دروازے بند نظر آئیں اور جو دروازہ کھلا ہوا ہو وہ صرف ایمان کا دروازہ ہو، قرآن کریم میں ایسے متشابہ کا وجود بہت ہی نادر ہے اور اس کا مقصد بھی بجز ایمان کے اور کچھ نہیں ہے، آیت بالا (سورۃ آل عمران) میں متشابہات سے یہی معنیٰ مراد ہیں۔

متشابہ اضافی قرآنِ کریم کا وہ حصہ ہے جس کی تفصیل خود قرآن کریم نے دوسری جگہ کر دی ہے، مثلاً کسی عام کی تخصیص[1] یا کسی مطلق کی تقیید، لیکن بے علمی یا کج فطرتی یا اتباعِ ھوی اس تحقیق کی فرصت نہیں دیتی کہ کلام کے سیاق وسباق کو دیکھا جائے، عام وخاص مطلق ومقید کے ارتباط کا لحاظ کیا جائے، بلکہ صرف یکطرفہ نظر کرکے قرآن کے خلاف ایک معنی پیدا کر لیتی ہے[2]۔"

علامہ شاطبی متوفی ۷۹۰ھ نے بھی "الموافقات" میں متشابہ کی دو قسمیں یعنی متشابہ حقیقی اور متشابہ اضافی بیان کرنے کے بعد ہر ایک کی وضاحت کی ہے[3]۔

---

[1] اصول فقہ کی کتابوں میں اس پر مفصل بحث ہے۔

[2] ترجمان السنۃ ج ۱ ص ۹۷

[3] تفصیل کے لیے "الموافقات للشاطبی" ج ۳ ص ۹۱-۹۲

محکم اور متشابہ کا علم

محکم تو اپنی مراد اور مقصد کے لحاظ سے واضح اور صاف ہوتا ہے، اس لئے اسکے علم میں اختلاف نہیں ہے، اپنی اپنی سمجھ اور علم کے مطابق اس کا پڑھنے والا فائدہ اٹھا سکتا ہے، لیکن متشابہ کے معنی چونکہ صاف اور واضح نہیں ہوتے اس لئے اس میں علماء کا اختلاف ہے، متکلمین، مفسرین اور فقہاء کی ایک بڑی جماعت کہتی ہے کہ متشابہ کی تاویل (اس کا صحیح مفہوم کہ جو مراد ہے) اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، یہ لوگ آیت مذکورہ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ اِلَّا اللّٰه میں اللہ پر وقف (ٹھہرنے) کو واجب کہتے ہیں اور وَالرَّاسِخُوْنَ کے واؤ کو عاطفہ نہیں مانتے بلکہ استینافیہ کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ متشابہات سے جو مراد ہے اس کا علم صرف اللہ کو ہے، کسی اور کو نہیں ہے اور "راسخون فی العلم" یعنی علم میں پختہ کار لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا ان متشابہات پر ایمان ہے اور سب (جن کے معنی ظاہر اور صاف ہیں اور جن کے صاف اور ظاہر نہیں) ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں، حضرت عبد اللہ بن عباس رضؓ، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضؓ اور حضرت اُبی بن کعب رضؓ فرماتے ہیں کہ متشابہات کا علم صرف اللہ کو ہے، حضرت عائشہ رضؓ کا رجحان بھی اس طرف تھا۔ عمر بن

عبدالعزیزؒ متوفی ۱۰۱ھ اور مالک بن انسؒ متوفی ۱۷۹ھ نے کہا ہم اس (متشابہ) پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن اس کی تاویل نہیں جانتے۔ ابن جریر بھی اسی کے قائل ہیں حضرت عمر فاروق رضؓ متشابہات کے پیچھے پڑنے والے لوگوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک شخص عبداللہ بن صبیغ نے لوگوں سے متشابہات کے بارے میں سوالات شروع کئے وہ کسی دوسرے شہر سے مدینہ آیا تھا، حضرت عمر رضؓ نے اس کو بلا کر سزا دی اور حکم دیا کہ جہاں سے آئے ہو وہیں واپس چلے جاؤ اور وہاں کے حاکم کو لکھ بھیجا کہ کوئی مسلمان اس شخص کے پاس نشست و برخاست نہ رکھے۔

سیوطی نے لکھا ہے کہ متشابہ کے علم کے بارہ میں ابن عباسؓ سے جو مختلف روایتیں منقول ہیں ان میں وہ روایت سب سے زیادہ صحیح ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے قائل تھے کہ متشابہ کا علم صرف اللہ کو ہے، سیوطی کے اس روایت کو اصح الروایات کہنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس روایت کے خلاف جو روایات ہیں ان کو بھی غیر صحیح نہیں کہا جا سکتا، اس کی مزید وضاحت آئندہ سطور میں کر دی جائے گی۔

ابوالحسن اشعریؒ[1] اور بہت سے مفسرین مثلاً ضحاک

---

[1] مباحث فی علوم القرآن ڈاکٹر صبحی الصالح ص ۲۸۲۔ ابوالحسن اشعری کی وفات ۳۲۴ھ میں ہوئی، طائفہ اشعریہ کے امام ہیں۔

متوفی ۱۰۵ھ، مجاہد وابن قتیبہ متوفی ۲۷۶ھ واؤ کو عاطفہ مان کر" والراسخون فی العلم" پر وقف کرتے ہیں اور اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ متشابہات سے جو مراد ہے اس کا علم اللہ کو ہے اور ان لوگوں کو بھی کہ جو علم میں پختہ کار ہیں۔

مشہور مفسر قرآن مجاہد رہ نے فرمایا کہ اگر راسخین فی العلم (علم میں پختہ کار) بھی متشابہ پر اس کو سمجھے بغیر ایمان لے آئیں تو پھر ان میں اور ان بے علم لوگوں میں کیا فرق رہے گا جو اس پر سمجھے بغیر ایمان لاتے ہیں۔ میں نے ایسے مفسر نہیں دیکھے کہ جو قرآن کی تفسیر کے وقت کسی جگہ یہ کہہ کر ٹھہر گئے ہوں کہ یہ متشابہ ہے، اس کی تاویل صرف اللہ جانتا ہے، مفسرین نے تو حروف مقطعات تک کے معانی بیان کر دیئے ہیں[1]۔

ابو اسحاق[2] شیرازی اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرے خیال میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے مخصوص کر لیا ہو، بلکہ بعض علماء کو بھی اس سے واقف کر دیا ہے، اس لئے کہ اس موقع پر

---

[1] ملخص از البرھان فی علوم القرآن ج ۲ ص ۷۲-۷۳۔

[2] ابو اسحاق شیرازی کا نام ابراہیم بن علی بن یوسف ہے، یہ بہت مشہور مناظر تھے، کئی کتابوں کے مصنف ہیں، ۴۸۶ھ میں وفات پائی۔

"الراسخون فی العلم" کی تعریف مقصود ہے، اگر ان کو بھی متشابہ کا علم نہ ہو تو پھر عام لوگوں اور علماء راسخین میں کچھ فرق نہ رہے گا۔

علامہ نووی شارح مسلم متوفی ۶۷۶ھ کے خیال میں زیادہ صحیح یہ ہے کہ علم میں پختہ کار لوگوں کو متشابہات کا علم ہوتا ہے، یہ بات عقل میں نہیں آتی کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ایسی باتیں بتائے کہ ان میں سے کوئی ان کو نہ سمجھ سکتا ہو۔[1]

بدر الدین زرکشی لکھتے ہیں کہ راغب اصفہانی نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں ذکر کیا ہے کہ عام متکلمین کا خیال ہے کہ اگر قرآن کا کچھ حصہ ایسا ہو کہ جس کو سمجھا نہ جا سکتا ہو تو پھر اس سے پورے طور پر فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔[2]

علامہ عبد العلی بحر العلوم متوفی ۱۲۲۵ھ نے لکھا ہے کہ کشف کے ذریعہ متشابہات کی تاویل (صحیح مراد) کا علم ہو سکتا

---

[1] ومنهم من يقف على قوله "والراسخون فى العلم" وتبعهم كثيرٌ من المفسرين واهل الاصول وقالوا الخطاب بما لا يفهم بعيد وقد روى ابن ابى نجيح عن مجاهد عن ابن عباس انه قال انا من الراسخين الذين يعلمون تاويله وقال ابن ابى نجيح عن مجاهد والراسخون فى العلم يعلمون تاويله ويقولون آمنا به ۔ ابن کثیر ج ۱ ص ۳۴۷ ومسلم مع الشرح للنووی ج ۲ ص ۳۳۹ کتاب العلم ۔

[2] البرهان فی علوم القرآن ص ۴۴،

ہے کہ جس میں بندہ کے اختیار کو دخل نہیں ہوتا۔[1]

شاہ ولی اللہ دہلوی رح کا آیات متشابہات میں مسلک[2]

شاہ صاحب رح کی تحقیق کے مطابق متشابہات کی کوئی ایسی جامع تعریف وتفسیر نہیں ہے کہ جس پر علماء کا اتفاق ہو، عموماً اہل علم متشابہات میں بحث و فکر روا نہیں رکھتے، جس کا اثر یہ ہوا کہ متشابہات میں غور وفکر نہ کرنے کو ایک اصول و عقیدہ کا درجہ حاصل ہوگیا، اور قرآن کے متعلق یہ خیال پیدا ہوگیا کہ اس کا کچھ حصہ کہ جو متعین بھی نہیں ہے، فہم انسانی سے بالاتر ہے، جس کی وجہ سے اوسط درجہ کی عقل رکھنے والے لوگوں کے دلوں میں یہ وہم وخدشہ پیدا ہونے لگا کہ غور وفکر کے بعد قرآن کی آیتوں

---

[1] فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت ص ۱۸۱

[2] مولانا عبید اللہ سندھی رح نے اپنے ایک طویل، مفید اور پر از معلومات مقالہ میں کہ جس کا عنوان "امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کا تعارف" ہے، آیات متشابہات کے متعلق شاہ ولی اللہ دہلوی رح کے افکار و خیالات کی ترجمانی کی ہے (تفصیل کے لئے "الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر دوسرا ایڈیشن سنہ ۱۹۶۰ء ص ۲۶۶ - ۲۶۵

کا جو مفہوم یا مطلب ہم نے سمجھا اور معین کیا ہے، ممکن ہے کہ اس کی نقیض یا اسکے برعکس مفہوم ان آیتوں میں موجود ہو کہ جن کو ہم نہیں سمجھ سکتے۔ اس غلط ڈھنگ سے سوچنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی توجہ قرآن مجید کی طرف کم ہونے لگی۔ شاہ صاحبؒ کے مسلک کے پیش نظر متشابہات میں غور و فکر کا حق صرف ایسے لوگوں کو ہے جو مسلسل طلب علم میں اپنی جان کھپاتے اور علمی جد و جہد میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کے خیال میں ایسے لوگوں کے لئے رسوخ فی العلم کا مرتبہ حاصل کر لینا ناممکن نہیں ہے[1]۔

---

[1] ہند میں متنِ قرآن کا درس سب سے پہلے شاہ ولی اللہؒ کے والد شاہ عبدالرحیمؒ نے شروع کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ قرآن مجید کو براہ راست مسلمانوں کے ذہنوں سے قریب کیا جائے اور ان کی توجہ تفاسیر کی طرف سے کم کی جائے۔ اس سے پہلے قرآن مجید صرف تلاوت کے لئے پڑھا اور پڑھایا جاتا تھا اور اسکے مطالب و معانی اپنے اپنے ذوق کے مطابق تفسیروں سے حل کئے اور سمجھے جاتے تھے اور نتیجہ کے طور پر کتاب اللہ سے لگاؤ کم ہو جاتا تھا۔ اپنے والد بزرگوار کے شروع کئے ہوئے کام کو شاہ ولی اللہؒ نے بڑی سرگرمی سے جاری رکھا، شاہ صاحبؒ نے فارسی زبان میں کہ جو اس وقت کے مسلمانوں کی شاہی زبان تھی "فتح الرحمٰن" کے نام سے قرآن کا ترجمہ کیا جو سنہ ۱۱۵۱ھ میں ختم ہوا۔ سنہ ۱۱۵۶ھ میں فتح الرحمٰن کی تدریس کا افتتاح ہوا (باقی حاشیہ ص ۱۹۵)

فواتح الرحموت میں ہے کہ فخر الاسلام متوفی ۴۸۲ھ اور شمس الائمہ (متوفی ۴۸۳ھ) دونوں امام اس کے قائل ہیں کہ قرآن میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کا علم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ ہو۔ بحر العلوم نے اسی قول کو پسند کیا اور لکھا ہے کہ اللہ کے شایان شان نہیں کہ وہ مخاطب کو کسی ایسی بات سے خطاب کرے کہ جس کو وہ نہ سمجھتا ہو[۱]۔

علامہ راغب اصفہانی کی اعتدال پسندی

علامہ راغب اصفہانی[۲] نے درمیانی راستہ اختیار کیا اور کہا کہ متشابہ پر اگر ہم اس لحاظ سے غور کریں کہ اسکے معنی کا علم ہو سکتا ہے یا نہیں تو اس کی تین قسمیں ہوں گی۔ متشابہ کی ایک قسم تو وہ ہے کہ جس کے جاننے کا کوئی ذریعہ اور طریقہ نہیں ہے جیسے کہ قیامت کے آنے کا وقت،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹۴) اس ترجمہ میں شاہ صاحبؒ نے تشریحی فوائد بھی لکھے ہیں۔ مولانا عبیداللہ سندھی لکھتے ہیں کہ ان تشریحی فوائد کی اہمیت یورپ میں جا کر میری سمجھ میں آئی۔ ملخص از الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر ۱۹۶۰ء

[۱] فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت ص ۱۷

[۲] الراغب الأصفهاني هو الحسين بن المفضل ابو القاسم ادیب کبیر، اہم کتبہ مفردات القرآن توفی ۵۰۲ھ

دابّۃ[۱] کے ظاہر ہونے یا نکلنے کا زمانہ اس کی کیفیت یا صفات اور اسی قسم کی بعض باتیں۔

متشابہ یا متشابہات کی دوسری قسم وہ ہے کہ انسان کے پاس اس کے جاننے کے ذرائع ہوں، جیسے کہ بہت کم استعمال ہونے والے یا نادر الفاظ کے معانی اور دقت میں ڈالنے والے احکام جن کا حل کرنا بہت دشوار ہو۔

متشابہ کی تیسری قسم سطور بالا میں ذکر کی ہوئی دونوں قسموں کے بیچ یا درمیان کی ہے اور یہ وہی قسم ہے کہ جس کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضؓ کے لئے دعا کرتے ہوئے فرمایا کہ اے اللہ ان کو دین کی سمجھ عطا کیجیے اور تاویل سکھایئے، اور آپؐ نے یہی دعا حضرت عبداللہ ابن عباس رضؓ کو بھی دی۔

دوسری قسم کے جاننے اور سمجھنے کے لئے علم لغت میں

---

[۱] قرآن مجید کی آیت "وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ لا اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ۔ (اور جب وعدہ (قیامت کا) ان پر پورا ہونے کو ہوگا تو ہم ان کے لئے زمین سے ایک جانور نکالیں گے کہ وہ ان سے باتیں کرے گا (اس لئے کہ لوگ ہماری (اللہ تعالیٰ کی) آیتوں پر یقین نہ لاتے تھے) یہ جانور عجیب قسم کا ہوگا لوگوں سے باتیں بھی کرے گا اور لوگوں کو تعجب اور حیرت میں ڈالنے والے کام کرے گا۔ حدیثوں میں علامات قیامت کے بیان میں اس کا ذکر اجمالی طور پر آیا ہے۔
سورۃ النمل آیت ۸۲

مہارت ضروری ہے، اس کے علاوہ مترجم قرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ اور ان کے شاگردوں نے قرآن کے نادر الفاظ کی جو تفسیر کی ہے وہ بھی اس میں مددگار ثابت ہوگی[1]

متشابہ کی اس تفصیل کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ "وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللهُ" پر وقف یعنی ٹھہرنا اور بغیر وقف کئے ہوئے اس کو "وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ" کے ساتھ ملا کر پڑھنا، دونوں صورتیں جائز ہیں[2]

مذکورہ بالا پس منظر میں مجاہدرح کے واسطہ سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول وہ روایت بھی سمجھ میں آجائے

---

[1] وبہترین شرح غریب قرآن آنست کہ اول از ترجمان القرآن عبداللہ بن عباسؓ از طریق ابن ابی طلحہ صحیح شدہ است وبخاری در صحیح خود غالباً بر ہمیں طریق اعتماد کردہ است وبعد ازان شرح ضحاک عن ابن عباس وجواب ابن عباسؓ از سوالات نافع ابن الازرق وایں ہر سہ طریق را سیوطی در اتقان ذکر کردہ است، بعد ازان شرح غریبے کہ بخاری از ائمہ تفسیر نقل کردہ است، بعد ازان شرح غریبے کہ سائر مفسرین اصحاب وتابعین وتبع تابعین روایت کردہ اند۔
(الفوز الکبیر فی اصول التفسیر ص ۱۷)

[2] المفردات فی غریب القرآن بالحذف والاضافۃ ص ۲۵۵

گی کہ جس میں انھوں نے فرمایا کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو متشابہ کی تاویل (صحیح مراد) جانتے ہیں، اور جس کے متعلق سیوطی نے کہا ہے کہ وہ زیادہ صحیح نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے یہ فرمانے سے کہ میں ان راسخین میں سے ہوں کہ جو متشابہ کی تاویل جانتے ہیں یہ لازم نہیں آتا کہ وہ متشابہ کی جملہ قسموں کی تاویل جانتے تھے، ہو سکتا ہے کہ متشابہ کی قسموں میں سے وہ اکثر کی تاویل (صحیح مراد) جانتے ہوں، لہٰذا ایسی صورت میں ان کا اَنَا مِنَ الرَّاسِخِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ تَاوِیْلَہٗ کہنا درست ہوگا۔ اب رہی حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کی وہ روایت کہ متشابہات کی تاویل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور جس کو علامہ سیوطیؒ نے زیادہ صحیح قرار دیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ متشابہ کی ہر ہر قسم یا تمام قسموں کا علم صرف اللہ کو ہے، یہاں تک کہ رَاسِخِیْنَ فِی الْعِلْمِ کو بھی متشابہ کے بارے میں اپنے محدود علم کو دیکھ کر وَمَا یَعْلَمُ تَاوِیْلَہٗ اِلَّا اللہ کہنا پڑتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ سے منقول دو مختلف روایتوں کی ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایک وقت ایسا تھا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرمایا کرتے تھے کہ متشابہ کا علم صرف اللہ کو ہے اور راسخین فی العلم کو بھی ایمان لاتے ہی بن پڑتی ہے، لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

دعا کا ظہور ہوا[1] اور شرح صدر ہو جانے کی وجہ سے وہ متشابہات کی تاویل سمجھنے لگے تو فرمایا کہ میں ان راسخین میں سے ہوں کہ جو متشابہ کی تاویل (صحیح مراد) جانتے ہیں۔

راغب اصفہانی نے متشابہ کی جو قسمیں بیان کی ہیں، اس سے علامہ نووی شارح مسلم متوفی ۶۷۶ھ اور ان کے ہم خیال علمار کے اعتراض کا جواب ہو جاتا ہے، کیونکہ جب علم میں پختہ کار یا راسخین فی العلم متشابہ کی اکثر قسموں کی تاویل (یعنی صحیح مراد) سمجھ سکتے ہیں اور یہی دوسروں کے مقابلے میں ان کی برتری ہے تو یہ کہنا درست نہیں ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ایسی باتوں سے خطاب فرمایا کہ جن کو وہ نہیں سمجھتے، لیکن راسخین فی العلم کے درجوں اور مرتبوں میں ان کے علم میں کمی بیشی کے اعتبار سے فرق ہو گا۔ کچھ "راسخین فی العلم" ایسے بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کے وسعت علم کے اعتبار سے قرآن میں متشابہات نہ ہونے کے برابر ہوں اور جن کو وہ اپنے علوم کسبیہ اور وہبیہ کی مدد سے سمجھ کر دوسروں کو بھی سمجھا سکتے ہوں۔ یہاں یہ کہنا مبالغہ نہ

---

[1] حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس رضی کے لئے یہ دعا فرمائی "اَللّٰھُمَّ فَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ وَعَلِّمْہُ التَّاوِیْل" (اے اللہ ان کو دین کی سمجھ دے دیجئے اور ان کو تاویل) سکھا دیجئے۔

ابن کثیر ج ۱ ص ۷، ۳۴۴

ہوگا کہ علماء متاخرین میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اسی پایہ کے عالم تھے۔ ابوالحسن اشعری رہ کہ جن کا مسلک متشابہات کے متعلق پہلے گزر چکا ہے، فرمایا کرتے تھے کہ ہر زمانہ میں کچھ ایسے علماء ہوتے ہیں کہ جو متشابہات کی تاویل جانتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ایک مقام ایسا آتا ہے کہ جہاں پہنچ کر راسخین فی العلم کو بھی اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہوئے وہی کہنا پڑتا ہے جو ملائکہ نے کہا اور ان الفاظ میں اپنے محدود علم کا اعتراف کیا۔

قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ

سورۃ البقرۃ آیت ۳۲ پ ۱

فرشتوں نے عرض کیا کہ آپ تو پاک ہیں، ہم کو علم ہی نہیں، مگر جتنا ہم کو آپ نے سکھا دیا۔ بے شک آپ بڑے علم والے حکمت والے ہیں۔

مثلاً اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کا علم اور جن سورتوں کے شروع میں حروف مقطعات ہیں اُن کے معانی کا علم، وہ آیتیں کہ جن کا تعلق صفاتِ باری سے ہے، مثلاً الرحمٰن علی العرش استویٰ اور اسی قسم کی بعض دوسری اشیاء کہ جن کی حقیقت اللہ کے سوا اس کے بتائے بغیر کوئی نہیں جان سکتا متشابہات میں سے ہیں۔

آیات متشابہ الصفات پر بحث[1]

جمہور اہلِ سنت کہ جن میں سلف بھی شامل ہیں اس پر متفق ہیں کہ ان آیتوں[2] پر ایمان رکھنا فرض ہے، اور ان کے معنیٰ و مراد کا علم اللہ کے سپرد یہ عقیدہ رکھتے ہوئے کرنا چاہیئے کہ ان آیتوں کے ظاہری معنیٰ مراد نہیں ہیں، کیونکہ قطعی دلائل اس کے خلاف موجود ہیں، یہ لوگ حضرت عائشہ رض کی اس روایت کو پیش کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے یہ پوری آیت هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ اٰیَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتَابِ وَاُخَرُ

---

[1] سیوطی رح نے لکھا ہے کہ ابن اللبّان نے آیات متشابہ الصفات پر ایک کتاب "ردّ المتشابہات الی الآیات المحکمات" لکھی ہے۔ ابن اللبّان دمشق کے بہت مشہور مفسّر گزرے ہیں، ان کا نام محمد بن احمد ہے ۷۴۹ھ میں وفات پائی۔

[2] مثلاً سورہ طٰہٰ کی آیت اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰی (وہ بڑی رحمت والا عرش پر قائم ہے) سورۃ الفتح میں یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ (اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے) سورۃ القصص میں كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (سب چیزیں فنا ہونے والی ہیں بجز اس کی ذات کے) اور اسی طرح کی متعدد آیات ہیں کہ جن کو آیات متشابہ الصفات یا آیات صفات بھی کہا جاتا ہے۔

مُتَشَابِهَات ... اُولُوا الْاَلْبَاب تک پڑھی، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ پڑھنے کے بعد آپؐ نے فرمایا، جب تم قرآن کے متشابہ کے پیچھے پڑنے والوں کو دیکھو تو ایسے لوگوں سے بچو کہ جن کو اللہ نے کج طبیعت اور فتنہ پرداز بتایا ہے۔[1]

امام مالکؒ متوفی ۱۷۹ھ سے کسی نے آیت اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى[2] میں استواء کا مطلب پوچھا، تو

---

[1] عن عائشۃؓ قالت تلا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ھذہ الآیۃ (ھو الذی انزل علیک الکتاب منہ ایاتٌ مُحکماتٌ) الیٰ قولہ وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّا اُولُوا الْاَلْبَاب، قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاذا رَاَیْتُمُ الَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَہَ مِنْہُ فاولٰئک الذین سمی اللہ فاحذروھم۔ لفظ البخاری وکذا رواہ الترمذی (ابن کثیر ج ۱ ص ۳۴۶)

[2] استوی القومُ فی المال اذا لم یفضل منہم احد علیٰ غیرہ و تساووا فیہ وھم فیہ سواء واستویٰ جالسًا واستویٰ علی العرش استقر واستویٰ المکان اعتدل و استویٰ الی العراق قصد واستوی علی سریر المُلک کنایۃٌ عن التملک وان لم یجلس علیہ۔ المصباح المنیر ج ۱ ص ۳۵۲ قال الراغب ومتیٰ عُدِّیَ بعلیٰ اقتضیٰ معنی الاستیلاء کقولہ عزوجلّ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى۔ تاج العروس ج ۱۰ ص ۱۸۹

انھوں نے فرمایا کہ استوی (کے معنی) تو معلوم ہیں لیکن اس کی کیفیت معلوم نہیں ہے اور اس کے متعلق سوال کرنا بدعۃ (دین میں نئی بات پیدا کرنا ہے) یہ کہہ کر اس شخص کو مجلس سے اٹھا دیا۔ امام مالکؒ کا مطلب یہ تھا کہ موقع محل اور لغت عرب کو سامنے رکھتے ہوئے استوار کے معنی کا تو علم ہے لیکن اللہ کی ذات کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کے استوار کی کیفیت معلوم نہیں اور تمھارا یہ پوچھنا کہ اس کیفیت کو بتا دیجیے دین میں نئی بات پیدا کرنا (بدعت) ہے اور جو شخص ایسا کرے اس سے الگ رہنا بہتر ہے تاکہ دوسروں پر اس کے خراب عقیدے کا اثر نہ پڑے۔[1]

امام رازیؒ اور آیات متشابہ الصفات

امام فخر الدین رازیؒ متوفی ۶۰۶ھ نے متشابہ الصفات کے لانے میں حکمت بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ قرآن مجید کی دعوت ہر خاص و عام کے لئے ہے، اور یہ دیکھا گیا ہے کہ عام لوگوں کی طبیعتیں حقائق کے سمجھنے، ان میں غور و فکر اور گہرائی میں جانے کو پسند نہیں کرتیں، بلکہ اس سے بچتی ہیں، عوام میں سے جب کوئی یہ سنتا ہے کہ ایک ایسی ذات موجود ہے کہ جو نہ جسم رکھتی ہے، نہ کسی جگہ میں سما سکتی ہے

---

[1] مذکرات فی علوم القرآن، شیخ محمد علی سلامہ

اور نہ اس کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے تو وہ الجھن میں پڑ جاتا ہے اور اسکی عقل ایسی ہستی یا ذات کو ماننے کے لئے آسانی سے آمادہ نظر نہیں آتی، جب صورت حال یہ ہے تو زیادہ بہتر طریقہ یہی ہے کہ عوام کو ان کے تصوّرات و خیالات کے لحاظ سے اس ہستی کے بارہ میں ایسے الفاظ کے ذریعہ بات سمجھانے کی کوشش کی جائے جس کو آسانی سے ان کی عقلیں اور ذہن قبول کر سکتے اور سمجھ سکتے ہوں[1]۔

درماندہ عقل انسانی کو صفات الٰہی سمجھانے کا انبیاء علیہم السلام نے کیا ڈھنگ اختیار کیا

"عقل انسانی کا ادراک محسوسات کے دائرہ میں محدود ہے، اس لئے اس کا تصوّر اس دائرہ سے باہر قدم نہیں نکال سکتا، وہ جب کسی ان دیکھی اور غیر محسوس چیز کا تصور کرے گی تو ناگزیر ہے کہ تصوّر میں وہی صفات آئیں جنھیں وہ دیکھتی اور سنتی ہے اور جو اس کے حاسّہ ذوق و لمس کی دسترس سے باہر نہیں ہیں، پھر اس کے ذہن و تفکر کی جتنی بھی رسائی ہے بیک دفعہ ظہور میں نہیں آئی

---

[1] ترجمہ از مباحث فی علوم القرآن عربی ص ۲۸۳-۲۸۴ ۔ ڈاکٹر صبحی الصالح

ہے۔ بلکہ طول طویل عرصہ کے نشو و ارتقار کا نتیجہ ہے۔

انبیار کرام (علیہم السلام) کی دعوت کی ایک بنیادی اصل یہ رہی ہے کہ انھوں نے ہمیشہ خدا پرستی کی تعلیم ویسی شکل و اُسلوب میں دی جیسی شکل و اسلوب کے فہم کی استعداد مخاطبوں میں پیدا ہو گئی تھی، وہ مجمع انسانی کے معلّم و مربّی تھے اور معلم کا فرض ہے کہ متعلّموں میں جس درجے کی استعداد پائی جائے اُسی درجے کا سبق بھی دے، پس انبیارِ کرام نے بھی وقتاً فوقتاً خدا کی صفات کے لئے جو پیرایۂ تعلیم اختیار کیا وہ اس سلسلۂ ارتقا سے باہر نہ تھا بلکہ اسی کی کڑیاں مہیّا کرتا ہے[۱]۔

صفاتِ باری اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ

اللہ تعالیٰ کی صفات کے استعمال کی ضرورت پر شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں :-

سب سے بڑھ کر نیک کام اللہ کی صفات پر ایمان اور یہ عقیدہ رکھنا ہے کہ اللہ ان صفات سے متصف ہے جو اللہ اور بندے کے درمیان تقرب کا دروازہ کھول دیتا ہے، اور بندہ کے لئے اس کی بزرگی و عظمت کو سمجھنے کا راستہ ہموار کرتا ہے۔ اللہ کی شان اس سے برتر ہے کہ

---

[۱] ترجمان القرآن، مولانا ابوالکلام آزاد۔ ج ۱ ص ۲۵۲ - ۲۵۳

اس کو کسی معقول یا محسوس چیز پر قیاس کیا جائے، یا یہ سمجھا جائے کہ صفات کا اس میں اسی طرح حلول ہے جس طرح عرض کا اپنے محل میں ہوتا ہے، اس کی شان اس سے بلند و بالا ہے کہ عام عقول انسانی کی اس تک پہنچ ہو سکے، یا عموماً جو الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں وہ ان سے سمجھ میں آجائے۔
لیکن یہ بہت ضروری ہے کہ لوگوں کو اس کے متعلق بتایا جائے تاکہ جہاں تک ہو سکے اس کو پہچاننے کے بعد وہ درجہ کمال تک پہنچ سکیں، لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ صفات کا استعمال کیا جائے اور وہ بھی اس ڈھنگ سے کہ صفات باری کے مبادی کو چھوڑ کر غایت و مقصد پر توجہ دی جائے، جیسے کہ "رحم" اللہ کی ایک صفت ہے تو رحمت کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ وہ نعمتیں عطا کرتا ہے، جو کہ رحمت کی غرض و غایت ہے اور مبدء کے پیش نظر دل کا نرم ہونا مراد نہ ہوگا (کہ جس سے ذات خداوندی منزہ ہے) اسی طرح تشبیہات کا استعمال بھی اسی شرط کے ساتھ کیا جا سکتا ہے کہ وہ مقصود بالذات نہ ہوں، بلکہ تشبیہات سے جو عرفی معنیٰ سمجھے جاتے ہیں وہ مراد لئے جائیں مثلاً "بسط الید" (ہاتھ کھول لینے) سے جود و سخا کے معنی لئے جائیں تاکہ سننے والے کو ایسا کوئی شبہ پیدا نہ ہو کہ جو ذات خداوندی کے لئے مناسب نہیں ہے تمام آسمانی مذاہب میں اللہ کی صفات کا استعمال اسی

ڈھنگ سے سمجھنا چاہیئے۔[1]

صفات باری کے سمجھانے میں قرآن نے تمثیل کا انداز کیوں اختیار کیا

نزولِ قرآن سے پہلے بلکہ اس کے نازل ہونے کے ابتدائی دور تک فکر انسانی اس درجہ بلند نہیں ہوئی تھی اور اس میں اس قدر پختگی نہیں آئی تھی کہ تمثیل کے بغیر صفاتِ الٰہی کو سمجھ سکتی اس لیئے اس وقت یہی ضروری تھا کہ صفاتی تصور کی بنیاد تمثیل و تشبیہ پر رکھی جائے، توراۃ کے طرز خطاب میں واضح طور پر انسانی اوصاف اور جذبات کی تشبیہات موجود ہیں، بلکہ توراۃ کے بعد بھی فکر انسانی کی پستی کو دیکھ کر حضرت عیسیٰؑ نے جب چاہا کہ رحمتِ الٰہی کا عالمگیر تصور پیدا کریں تو مجبوراً ان کو خدا کے لیئے تشبیہ کے طور پر باپ کا لفظ استعمال کرنا پڑا، کیونکہ اس دور کا طریقہ یہ تھا کہ جس سے سب سے زیادہ محبت کرتے اس کو باپ کہہ کر خطاب کرتے تھے[2] لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ظاہر پرستوں نے کچھ

---

[1] تفصیل کے لیئے حجۃ اللہ البالغہ (عربی) ج ۱ ص ۶۳ مطبوعہ مصر

[2] "تمام ملتیں اور ادیان سماویہ اس پر متفق رہے ہیں کہ خدا کی صفات کمال کو محاورات اور معروف الفاظ میں ذکر کیا جائے (باقی حاشیہ ص ۲۰۸ پر)

ہی عرصہ گزرنے پر ٹھوکر کھائی اور حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا کہنے لگے۔ یا جس طرح شروع شروع میں حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا محبوب ترین پیغمبر ظاہر کرنے کے لئے تمثیلی طور پر ابن اللہ کہا گیا، لیکن بعد میں تمثیل کو حقیقت بنا لیا گیا۔ لیکن ان تمام تصورات کے بعد جب ہم قرآن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ان میں تشبیہ و تمثیل کا انداز پہلے کی نسبت بہت کچھ بدلا ہوا نظر آتا ہے اور اس کی تعبیرات سے جو شبہات اور اوہام پیدا ہو سکتے تھے ان کو دور کرنے کے لئے بہت صاف الفاظ میں یہ بتا دیا جاتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۷) تاکہ عام عقلیں خدا کو پہچان سکیں اور ساتھ ہی " لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ " (کوئی چیز اس کی مثل نہیں) سے بھی آگاہ کر دیا تاکہ خالق اور مخلوق میں کسی قسم کا قیاس نہ جاری کر سکیں اور زیادہ بحث و تفتیش میں نہ پڑیں، انسان اپنے محدود اور ناقص اور قلیل علم سے اس خداوند قدوس کے لئے بے کم کیف اور بے حدو پایاں ذات کا تو درکنار اپنی ہی ذات کا پورا ادراک نہیں کر سکتا، تمام حکماء ختم ہو گئے مگر جسم اور روح کی حقیقت آج تک نہ سمجھا سکے، ہاں اجمالی طور سے صرف اس قدر معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ ذات جامع کمالات ہے اور اپنی ذات و صفات کے اعتبار سے بے مثل و یکتا ہے"

(علم الکلام ص ۱۲۲ از مولانا محمد ادریس کاندھلوی)

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَّ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ — کوئی چیز اس کی مثل نہیں (تم کسی چیز کو اسکے مشابہ نہیں کہہ سکتے) اور وہی سننے والا دیکھنے والا ہے۔

سورۃ الشوریٰ آیت ۱۱ پ ۲۵

دوسری جگہ ہے۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ — اس کو تو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہو سکتی اور وہ سب نگاہوں کو محیط ہو جاتا ہے اور وہی بڑا باریک بیں باخبر ہے۔

سورۃ الانعام آیت ۱۰۲ پ ۷

یہی وجہ ہے کہ توراۃ میں جہاں خدا کے ظہور کا ذکر ہے قرآن اس کی بجائے خدا کی تجلّی کا ذکر کرتا ہے اور تشکل و تجسم کے شائبہ کو دور کرنے کے لئے صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ اے موسیٰؑ تمھاری یہ درخواست

رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ — اے میرے پروردگار اپنا دیدار مجھ کو دکھلا دیجئے تاکہ میں آپ کو ایک نظر دیکھ لوں۔

سورۃ الاعراف آیت ۱۴۳ پ ۹

مناسب نہیں ہے اور اس کا جواب ہے "لَنْ تَرٰىنِيْ" (تم مجھ کو ہرگز نہیں دیکھ سکتے) لیکن چونکہ تم بڑے والہانہ اور بےتابانہ انداز میں درخواست کر رہے ہو اس لئے تم (اس) پہاڑ کی طرف دیکھو، ہم اپنی ایک جھلک اس پر ڈالتے ہیں اگر یہ اپنی جگہ برقرار رہے تو اس سے تم کو اندازہ ہو جائے گا کہ تم ہم کو دیکھ سکو گے، حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے پہاڑ کی طرف دیکھ رہے تھے کہ پروردگار نے اس پر تجلّی فرمائی

اور اس کے پرخچے اُڑ گئے اور موسیٰ (علیہ السلام) بے ہوش ہو کر گر پڑے، اور جب ہوش آیا تو اپنی جرأت پر معذرت کرتے ہوئے کہنے لگے کہ آپ کی شان بہت بلند ہے میں تو (بن دیکھے پہلے ہی) ایمان لا چکا ہوں۔

فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّاۤ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ

سورۃ الاعراف آیت ۱۴۳ پ ۹

پس ان کے رب نے جب اس پر تجلی فرمائی تو تجلی نے اس کے پرخچے اڑا دئے اور موسیٰؑ بے ہوش ہو کر گر پڑے پھر جب ہوش میں آئے تو کہنے لگے بے شک آپ کی ذات منزہ ہے میں آپ سے معذرت کرتا ہوں اور سب سے پہلے میں (اس پر) یقین رکھتا ہوں۔

قرآن اور اعتدال کی راہ

قرآن کریم نے تشبیہ و تمثیل کی نفی کے بعد ایک بیچ کی راہ نکالی اور خدا کے تصوّر کے لئے صفات و افعال کا اس ڈھنگ سے ذکر کیا جہاں کچھ نہ کچھ فکر انسانی کی پہنچ ہو سکے اور اسکے ذریعہ وہ ایک حقیقت یا ہستی کے متعلق سوچ سکے یا سوچنے کے قابل ہو جائے۔ قرآن نے اس کی پرواہ نہیں کی کہ اس طرز ادا سے جسمانیت کا شائبہ پیدا ہو جائے گا، کیونکہ سامنے ایک بڑا خطرہ یہ تھا کہ اگر سمجھانے کا یہ ڈھنگ بھی اختیار نہیں کیا گیا تو

اپنی خلقت کے اعتبار سے یہ کمزور انسان ایک ایسی ہستی یا ذات کا تصور ہی نہ کر سکے گا کہ جو اس کے اپنے لئے بہت ضروری ہے، اس لیئے کہ خدا کی ہستی کا اعتقاد انسانی فطرت کے اندرونی تقاضوں کا بلند ترین جواب ہے، انسان کو حیوانی سطح سے بلند ہونے اور انسانیت کے اعلیٰ مراتب تک پہنچنے کے لیئے ایک نصب العین کی ضرورت ہے لیکن وہاں تک رسائی یا پہنچ ایسی ہی صفات کا سہارا لینے سے ہو سکتی ہے کہ جو اُس کی سمجھ میں آ سکتی ہوں، کیونکہ غیر صفاتی تصوّر انسانی فکر کی گرفت میں نہیں آ سکتا، قرآن میں خدا کی بہت سی صفات و افعال کا اثبات کیا گیا ہے مگر اس کے ساتھ مشابہت کی نفی بھی کر دی گئی ہے، وہ بتاتا ہے کہ خدا ان تمام صفات سے متّصف ہے جن کو انسان سمجھ سکتا ہے، وہ زندہ ہے، قدرت والا ہے، پالنے والا ہے، رحیم ہے، کریم ہے، سنتا ہے، دیکھتا ہے، ہر ہر چیز کو خوب جانتا ہے لیکن اس کے زندہ ہونے، دیکھنے، سُننے، جاننے، پالنے والا ہونے، رحیم و کریم وغیرہ ہونے کا تصوّر ویسا نہیں ہے جو کہ ان صفات و افعال کا ہمارے ذہنوں میں ہے۔

" اور اگر مخلوقات کو خالق کے ساتھ وجود، علم، قدرت و حیات میں کچھ مشابہت ہے بھی تو برائے نام۔ زمین کی روشنی اور چمک کو آفتاب کی روشنی سے کیا نسبت، اگر ہے

تو وہ برائے نام، سب جانتے ہیں کہ وہ آفتاب ہی کا فیض ہے ورنہ زمین کی روشنی کجا اور نور آفتاب کجا۔ اس کی حیات ہماری حیات کی طرح نہیں، اس کا سننا اور دیکھنا اور کلام کرنا ہمارے سننے، دیکھنے اور کلام کرنے کے مشابہ نہیں ہے، وہ اپنے سننے، دیکھنے ادراک اور علم میں جوارح کا محتاج نہیں، اس کے عُلُو کے لئے کوئی مکان اور جہت نہیں، اُس کے نزول اجلال کے لئے کوئی حرکت نہیں، اس کی رضا وغضب کی کوئی کیفیت نہیں، بہرحال اس کی شان اعلیٰ اِس سے برتر ہے کہ کسی عقلی یا حسّی شئے کو اس پر قیاس کرسکیں، لیکن تقرّب الی الفہم کے لئے اس کی شئون اور صفات کو ان ہی (انسانوں) کی زبان اور محاورات میں ذکر کیا جاتا ہے[1]"

جب یہود نے اللہ پر بخل کا الزام لگاتے ہوئے کہا۔

یَدُ اللّٰہِ مَغْلُوْلَۃٌ ط اللہ کا ہاتھ بند ہوگیا ہے

تو قرآن نے اسی انداز کو اختیار کرتے ہوئے جواب دیا۔

غُلَّتْ اَیْدِیْھِمْ (در حقیقت) ان ہی کے ہاتھ بند
وَ لُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ہیں (یعنی واقع میں وہ خود عیب
بَلْ یَدٰہُ مَبْسُوْطَتٰنِ بخل میں مبتلا ہیں اور خدا پر عیب

---

[1] علم الکلام۔ از مولانا محمد ادریس کاندھلوی ص ۱۲۲

يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ط سورۃ المائدۃ آیت ۶۴ پ ۶

دھرتے ہیں) اور اپنے اس کہنے سے یہ رحمت (الٰہی) سے دور کر دئے گئے ہیں، بلکہ ان کے تو دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں (دیتی بہت سخی ہیں) جس طرح چاہتے ہیں خرچ کرتے ہیں۔

غور کرنے سے سمجھ میں آجائے گا کہ یہود کے الزام کا اس سے زیادہ معقول جواب اور کیا ہو سکتا ہے کہ تم تو یہ کہتے ہو کہ اللہ کا ہاتھ بند ہے، تمھارا یہ کہنا درست نہیں، اس کے تو دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں، جو دوسخا ظاہر کرنے کے لئے کنایہ کے طور پر قرآن میں تفسیر کا یہ ڈھنگ اختیار کیا گیا۔

"علامہ زمخشری نے (متوفی ۵۳۸ھ) کہا ہے کہ بَسْطُ الْيَدْ (ہاتھ کا کھلا ہونا) سخاوت کے لئے کنایہ اور تمثیل کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، حالانکہ اللہ کے ہاتھ ہی نہیں جو کھلے، وہ اس سے منزہ ہے۔ صاغانی (متوفی ۶۵۰ھ) کہتے ہیں کہ یہ سخاوت کے لئے کنایہ کے طور پر استعمال ہوا ہے جیسے کہ بادشاہ کے لئے کہا جاتا ہے کہ اس کا ہاتھ کھلا ہوا ہے اگرچہ وہ اپنے ہاتھ سے لوگوں کو کچھ نہ دیتا ہو بلکہ دوسروں کے ذریعہ اشارہ اور حکم سے بخشش کرتا ہو[۱]۔"

---

[۱] تاج العروس ج ۵ فصل البار من باب الطار ص ۱۰۷

اسی قسم کے دوسرے الفاظ مثلاً وَجْہُ، اِستواء، عرش کُرسی، عین، جَنبُ، یمین وغیرہ پر اگر غور کیا جائے تو سمجھ میں آجائے گا کہ ان سب کا استعمال انسانی ذہن کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے، لیکن جس طرح کہ ذاتِ خداوندی کی حقیقت اور چگونگی کا علم نہیں اسی طرح ان الفاظ کی حقیقت بھی معلوم نہیں، اسی لئے ان پر زیادہ غور و فکر سے روک دینے کے بعد ان پر ایمان لانے پر زور دیا گیا ہے، اسی کے پیشِ نظر حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا، ان کو "رَاسِخُونَ فِی الْعِلْمِ" (علم میں پختہ کار اس لئے کہا گیا کہ وہ متشابہ قرآن پر ایمان لائے حالانکہ ان کو اس کا علم نہ تھا۔[1]

متشابہا عقول کی آزمائش کے لئے ہیں

کہا گیا ہے کہ عقل جو تمام جسم میں معزز یا اعلیٰ ہے اگر آزمائش میں نہ ڈالی جاتی تو پورے اعتماد سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ عالم شخص نخوت (گھمنڈ) کے نشہ میں سرشار ہو کر سرکشی اور نافرمانی کرنے لگتا اسی وجہ سے وہ ربّ العزت کے سامنے بندگی کے لئے سر جھکاتا ہے اور متشابہ ہی وہ جگہ ہے جہاں عقلیں اپنے خالق کے سامنے اپنی کوتاہی کا اعتراف کرتے ہوئے سر جھکاتی اور اس کی عظمت

---

[1] ترجمہ از الاتقان عربی ص ۲۳۰

کو تسلیم کرتی ہیں۔[1]

متشابہات کے ذکر میں کیا کیا فوائد اور حکمتیں ہیں اس کو آئندہ صفحات میں بیان کیا جائے گا۔

مولانا ابو الکلام آزادؒ لکھتے ہیں۔

"صفات الٰہی کی حقیقت متشابہات میں داخل ہے، اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ اس باب میں فکری کاوشیں کچھ سود مند نہیں ہو سکتیں، بلکہ طرح طرح کی کج اندیشیوں کا دروازہ کھول دیتی ہیں، یہاں بجز تفویض چارہ نہیں ہیں پس وہ تمام فلسفیانہ کاوشیں جو ہمارے متکلمین نے کی ہیں فی الحقیقت قرآن کے معیارِ تعلیم کا ساتھ نہیں دے سکتیں۔"[2]

صفاتِ الٰہی اور متکلّمین

جب علم کلام کا زور ہوا اور مختلف مذاہب اور فرقے پیدا ہو گئے تو صفاتِ باری کے مسئلہ پر لمبی چوڑی بحثیں اور مناظرے ہونے لگے، جن کی وجہ سے یہ گتھی سلجھنے کی بجائے اور الجھتی چلی گئی، کسی نے صفاتِ باری سے صاف الفاظ میں انکار کر دیا کسی نے صاف بات کہنے سے پہلو تہی کی لیکن جھکاؤ انکار کی طرف رہا، انصاف پسند طبیعت رکھنے والوں نے

---

[1] ترجمہ از الاتقان عربی ص ۲۳۔

[2] ترجمان القرآن ج ۱ ص ۳۰۹ (مولانا ابو الکلام آزاد)

اس گرہ کو کھولنے کے لئے قرآن کا بنایا ہوا راستہ اختیار کیا اور امام فخر الدین رازیؒ ۱ (متوفی سنہ ۶۰۶ھ) جیسے نکتہ داں، نکتہ رس، نکتہ شناس اور نکتہ آفریں کو سب کچھ لکھنے کے بعد آخر میں اپنی عاجزی کا ان الفاظ میں اعتراف کرنا پڑا۔

لَقَدْ تَاَمَّلْتُ الطُّرُقَ الْكَلَامِيَّةَ وَالْمَنَاهِجَ الْفَلْسَفِيَّةَ فَمَا رَاَيْتُهَا تَشْفِيْ عَلِيْلًا وَّلَا تَرْوِيْ غَلِيْلًا وَرَاَيْتُ اَقْرَبَ الطُّرُقِ طَرِيْقَ الْقُرْاٰنِ، اِقْرَاْ فِي الْاِثْبَاتِ "اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" وَاِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَاقْرَءْ ۲ فِي النَّفْيِ

میں نے علم کلام کے طریقوں اور فلسفے کے ڈھنگوں پر غور کیا، میں نے ان میں نہ تو کسی بیمار کے لئے شفا دیکھی اور نہ کسی پیاسے کے لئے سیرابی پائی، میں نے دیکھا کہ منزل مقصود تک پہنچانے کے لئے نزدیک تر راستہ قرآن کا ہے۔ اثباتِ صفات میں پڑھو "اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" اور اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ اور نفی تشبیہ میں پڑھو

---

۱ هو محمد بن عمر الحسن بن الحسين ابو عبد الله فخر الدين الرازي من تصانيفه، مفاتيح الغيب في تفسير القرآن و لوامع البينات في شرح اسماء الله تعالى والصفات و معالم اصول الدين و اسرار التنزيل

۲ اقرء کو دونوں جگہ واحد متکلم کا صیغہ بھی پڑھ سکتے ہیں۔ ترجمہ صیغہ امر کے اعتبار سے کیا گیا ہے۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَلَا يُحِيطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا	لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَلَا يُحِيطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا
ثُمَّ قَالَ مَنْ جَرَّبَ	اس کے بعد امام رازیؒ نے کہا جس شخص
مِثْلَ تَجْرِبَتِيْ عَرَفَ	کو میری طرح تجربہ کا موقع ملا ہوگا اس
مِثْلَ مَعْرِفَتِيْ [1]	پر میری طرح یہ حقیقت ظاہر ہو گئی ہوگی

عبدالکریم شہرستانی متوفی ۵۴۸ھ فلاسفہ اور متکلمین کے متعلق اظہار خیال ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

" تمام درس گاہوں میں جانے کے بعد میں کہتا ہوں کہ میں نے فلاسفہ اور متکلمین کو حیرت زدہ اور نادم پایا۔[2]

ابوالمعالی ابن الجوینی (امام الحرمین) (متوفی ۴۷۸ھ) نے علم کلام کے متعلق ان الفاظ میں اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔

دوستو علم کلام میں مشغول نہ ہونا۔ اگر میں جانتا کہ علم کلام مجھ کو اس حد تک پہنچا دے گا تو اس میں مشغول نہ ہوتا۔

یہی ابن الجوینی علم کلام میں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کرنے اور اسلامی علوم کی طرف پورے طور پر توجہ نہ دینے پر اظہار افسوس کرتے ہوئے اپنی وفات کے وقت کہتے ہیں۔

---

[1] شرح فقہ اکبر ملا علی قاری الحنفی ص ۷، مطبع آفتاب ہند سنہ ۱۲۷۷ھ

[2] ایضاً

فَالْوَيْلُ لِابْنِ الْجُوَيْنِي
وَهَا أَنَا ذَا أَمُوْتُ
عَلَىٰ عَقِيْدَةِ أُمِّيْ أَوْ
قَالَ عَلَىٰ عَقِيْدَةِ عَجَائِزِ
أَهْلِ نَيْشَابُوْرَ ؎

ابن جوینی پر افسوس ہے! میرا انتقال میری ماں کے عقیدہ پر ہو رہا ہے راوی کو شک ہے کہ ابن الجوینی نے یہ کہا تھا، یا یہ کہا تھا کہ میرا انتقال اس عقیدہ پر ہو رہا ہے کہ جو نیشاپور کی بوڑھی عورتوں کا ہے۔ (جو میرے لئے کسی قدر سکون کا باعث ہے)

صفاتِ الٰہی پر صحابہ کرامؓ کا ایمان

صحابہ کرام رض کا تمام قرن اسی طرح سے گزرا کہ وہ خدا کی صفاتِ کمالیہ پر ایمان رکھتے تھے اور تنزیہہ وتقدیس کے لئے "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ" پڑھ لیا کرتے تھے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان صفات کے ذکر سے مقصد صرف اس قدر ہے کہ ہم ان صفات کے ذریعہ سے اپنے خالق کو پہچان سکیں اور یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ ہماری طرح آنکھ سے دیکھتا ہے اور کان سے سنتا ہے، اس لئے کہ جس طرح اُس کی ذات بے چون وچگون ہے اسی طرح اس کی صفات اور شئون بھی بے چون وچگون ہیں۔ ان ہی صفات متشابہات میں سے استواء علی العرش بھی اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے جو اسکے شایانِ شان ہے۔ پس جس طرح وہ بغیر آنکھ

؎ شرح فقہ اکبر۔ لملا علی القاری الحنفی ص ۷

اور کان کے سمیع و بصیر ہے۔ ٹھیک اسی طرح وہ بغیر جہت اور مکان کے مستوی علی العرش بھی ہے۔ اگر بغیر آنکھ اور کان کے دیکھنا اور سننا ممکن ہے تو بغیر جہت اور مکان کے عرش پر مستوی ہونا بھی ممکن ہے اور جس طرح اسکے علم اور سمع و بصر کی کیفیت حیطۂ عقل سے باہر ہے، اسی طرح استوار علی العرش کی کیفیت بھی ادراک سے خارج ہے۔[1]

متشابہات کے سلسلہ میں لمحہ فکر

علمار متقدین اور متاخرین میں سے متعدد لوگوں نے متشابہات کے متعلق اپنے اپنے انداز میں وہی بات کہی ہے کہ جو شاہ ولی اللہ دہلوی رح نے کہی ہے۔ قرآنِ کریم بار بار تفکر اور تدبّر کی دعوت دیتا ہے اور صاف الفاظ میں یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ متشابہات تو بس ایمان لانے کے لئے ہیں، ان پر غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے، اور اس قسم کے مطالبہ کا قرآن کی اُس روح سے کچھ جوڑ بھی نہیں لگتا کہ جس کے مخاطب اہلِ عقل ہیں، عقل یہ بات ماننے کے لئے آسانی سے تیار نہیں ہوتی کہ جو بات سمجھ میں نہ آئے اس کو متشابہ کہہ دیا جائے۔ جب راسخین فی العلم (پختہ علم والوں) کے مدارج

---

[1] علم الکلام۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی ص ۱۲۳-۱۲۴

مختلف ہیں تو یہ بھی ممکن ہے کہ جس چیز کو ایک شخص متشابہ کہتا ہے وہی چیز دوسرے کے نزدیک متشابہ نہ ہو اگرچہ یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ بعض ایسے مواقع آئیں گے کہ جہاں عقل کے لئے اپنے عجز کا اعتراف ناگزیر ہوگا۔

تفسیر اور اصول تفسیر کے ماہرین نے متشابہ کی کوئی ایسی جامع اور مانع تعریف نہیں کی کہ جس کو سامنے رکھ کر متشابہ اور غیر متشابہ میں فرق کیا جا سکے، قرآن میں یہ ضرور بتایا گیا ہے کہ اس میں محکمات اور متشابہات دونوں ہیں، کج رو اور فتنہ پرداز اپنی من مانی باتوں کی تائید حاصل کرنے کے لئے متشابہات کے پیچھے لگ جاتے ہیں جو پختہ علم والے اہلِ ایمان کا شیوہ نہیں ہے۔ محکم ہو یا غور و فکر کے باوجود سمجھ میں نہ آنے والے متشابہات وہ سب پر ایمان لاتے ہیں، لیکن اگر کوئی شخص نیک نیتی سے متشابہات کے معانی و مطالب سمجھنے کی کوشش میں لگا رہے اور نتیجہ کے طور پر وہ کامیاب ہو یا ناکام، قرآن ایسا کرنے سے اس کو نہیں روکتا۔

لہ سورۂ آل عمران کی زیر بحث آیت میں لفظ اللہ پر وقف کرنا اور نہ کرنا دونوں جائز ہیں، لہٰذا وقف نہ کرنے کی صورت میں متشابہات کے سمجھنے کے لئے تفکر و تدبر میں مضائقہ نہیں بشرطیکہ غور کرنے والا پختہ کار ہو اور اس کے پیشِ نظر سمجھنا ہو نہ کہ فتنہ پردازی۔

متشابہات کے ذکر میں حکمتیں اور فائدے

یہ بات قابلِ غور ہے کہ قرآن مجید انسانوں کی ہدایت، اصلاح اور جن باتوں کا علم نہیں ہے ان کے بتانے اور سمجھانے کے لئے نازل کیا گیا ہے، تو پھر متشابہات کے نازل کرنے میں کیا فائدے اور کیا حکمتیں ہیں؟ علوم القرآن کے ماہرین نے اس کی حکمتیں بیان کی ہیں۔ زرکشی کہتے ہیں کہ اگر حکمت یا فوائد کے جاننے کا سوال ان متشابہات کے متعلق ہے کہ جن کا سمجھنا اور جاننا ممکن ہے تو پھر ایسے متشابہات کے ذکر سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ علماء کو قرآن مجید پر غور و خوض کے مواقع زیادہ میسر آئے اور انھوں نے بقدرِ امکان متشابہ کو سمجھنے کے لئے قرآن کی گہرائی میں جاکر اس کی باریکیوں کو جاننے کی کوشش کی اور بارگاہِ خداوندی میں تقرب حاصل کیا، اس لئے کہ قرآن مجید میں بار بار آیاتِ قرآنی پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ برخلاف اس کے اگر پورا قرآن محکم یا آسانی سے کسی قسم کے غور و خوض کے بغیر سمجھ میں آجانے والا ہوتا تو علماء اس کی صحیح مراد یا مقصد سمجھنے کے لئے اس قدر جد و جہد اور سبقت نہ کرتے اور نتیجہ کے طور پر ایک بڑے ثواب کے کام سے محروم ہو جاتے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کا کچھ حصہ محکم ہے کہ جو آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے اور

کچھ متشابہ ہے کہ جس کی مراد واضح نہ ہونے کی وجہ سے اس کے سمجھنے، اس سے مسائل نکالنے، اس کو سلجھانے اور اس کو محکم کی طرف لوٹانے کے لئے دقّت نظر سے کام لینا پڑتا ہے۔[۱]

متشابہات کے ذکر میں یہ حکمت و فائدہ بھی ہے کہ علمی برتری حاصل کرنے کے لئے ان پر غور و فکر کرنے والا مختلف علوم کے مطالعہ سے اپنا علم بڑھانے کی مسلسل کوشش میں لگا رہتا ہے اور یہ بلند ہمت لوگوں کا شیوہ ہے۔ اور اگر وہ متشابہات ایسے ہیں کہ جن کا جاننا یا سمجھنا بظاہر ممکن نہیں ہے، جیسے کہ حروف مقطّعات الٓمٓ۔ حٰمٓ، الٓرٰ، الٓمٓصٓ، کٓھٰیٰعٓصٓ وغیرہ کہ جو بعض سورتوں کے شروع میں ہیں، یا اسی قسم کے بعض دیگر متشابہات تو ان کا ذکر بھی فوائد و حکمت سے خالی نہیں، مثلاً یہ کہ اس سے مومنین کی آزمائش مقصود ہے کہ متشابہات پر بعض غیبی امور کی طرح ایمان رکھیں اور فلاح پانے والے (کامیاب لوگوں) کی صف میں شامل ہو جائیں جن کی طرف سورۃ البقرہ کے شروع میں اشارہ کیا گیا ہے

الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ	الم ۔ یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں، راہ بتلانے والی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو، وہ خدا

---

[۱] البرہان فی علوم القرآن ج ۲ ص ۷۵

بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ ج وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ ق وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

سے ڈرنے والے لوگ ایسے ہیں کہ یقین رکھتے ہیں چھپی ہوئی چیزوں پر اور قائم کرتے ہیں نماز کو اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ یقین رکھتے ہیں اس کتاب پر بھی جو آپ پر اتاری گئی ہے اور ان کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے اتاری جا چکی ہیں اور آخرت پر بھی وہ لوگ یقین رکھتے ہیں یہ لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو ان کے پروردگار کی طرف سے ملی ہے اور یہ لوگ ہیں پورے کامیاب۔

مفسرین نے غیب کی تفسیر اللہ پر، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، قیامت کے دن، جنت و دوزخ، اللہ کے دیدار اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر ایمان لانے سے کی ہے اور ان کو امورِ غیبیہ کہا ہے۔

لہ قَالَ ابو جعفر الرّازی عن الربیع بن انس عن ابی العالیۃ فی قولہٖ تعالٰی (یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ) قَالَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَجَنَّتِہٖ وَنَارِہٖ وَلِقَائِہٖ وَیُؤْمِنُوْنَ بِالْحَیَاۃِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَبِالْبَعْثِ۔ تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۴۱

حروفِ مقطّعات

قرآن مجید کی کسی کسی سورۃ کے شروع میں جو حروف مُفردہ آئے ہیں جیسے الٓمٓ، حٰمٓ، الٓرٰ وغیرہ ان کو حروف مقطعات کہا جاتا ہے، ان کے معانی امّت کو نہیں بتائے گئے۔ مفسّرین نے مقطّعات کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان حروف کو لاکر قرآن کے مخالفین کو یہ بتانا مقصود تھا کہ یہ کتاب حروف ہجا یعنی ا ب ت ث وغیرہ سے مرکب ہے اور ان ہی حروف میں نازل کی گئی ہے کہ جن کو لوگ اپنی بول چال میں استعمال کرتے ہیں۔ اگر لوگوں کو شک ہے کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے نہیں ہے تو وہ بھی ان ہی حروف سے ایسی کتاب بنا کر لے آئیں، لیکن یہ سن لیں کہ اگر سارے انسان اور جن مل کر بھی چاہیں تو ایسی کتاب کا لانا تو درکنار، اس کی جیسی دس سورتیں یا ایک سورۃ بلکہ اس کتاب کے انداز کی ایک ہی بات پیش کر دیں اور ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ ہرگز ایسا نہیں کر سکتے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ حکومتیں خفیہ احکام وغیرہ کے لئے کچھ اشارے مقرر کر لیتی ہیں جن کو اشاروں کا کلام (CODE) کہا جاتا ہے اور ان کو خاص حالات میں استعمال کیا جاتا ہے، وہ صرف رازدار اور قابل اعتماد لوگوں کو بتائے جاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اسی طرح سے

مصلحت کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ان حروف کو اشاروں کے کلام (CODE) کے طور پر استعمال کیا ہو اور ان کے مفہوم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو واقف کر دیا ہو، تاکہ اگر کسی سورۃ کے شروع میں ان میں سے کوئی حرف یا حروف نازل کئے جائیں تو آپ سمجھ جائیں کہ دینی، ملکی، اخلاقی، اقتصادی اور سیاسی حالات کے پیش نظر کیا ہدایات دی جا رہی ہیں، اور پھر ان ہی کے لحاظ سے فرائض نبوت انجام دیں۔

حروف مقطعات کے متعلق ایک مختار قول یہ ہے کہ وہ ایسے اسرار میں سے ہیں کہ جن کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔[1]

---

[1] الاتقان للسیوطی، نوع ۴۳

مآخذ و مراجع

عربی کتب

۱۔ الاتقان فی علوم القرآن ۔ مصنفہ جلال الدین سیوطیؒ مطبوعہ ہند سنہ ۱۲۸۰ھ
۲۔ اسباب النزول ۔ مصنفہ علی بن احمد الواحدی، مطبوعہ مصر سنہ ۱۳۸۸ھ
۳۔ الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ ۔ مصنفہ ابن حجر شہاب الدین، احمد بن علی، مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۸۷۳ء
۴۔ انوار التنزیل واسرار التاویل المعروف بتفسیر البیضاوی۔ مصنفہ ناصر الدین عبداللہ بن عمر الشافعی، مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ سنہ ۱۲۸۲ھ
۵۔ البرہان فی علوم القرآن ۔ مصنفہ بدر الدین محمد بن عبداللہ الزرکشی مطبوعہ مصر سنہ ۱۳۷۶ھ
۶۔ تاج العروس من جواہر القاموس ۔ مصنفہ سید محمد مرتضٰی الحسینی الواسطی، مطبع خیریہ، مصر سنہ ۱۳۰۶ھ
۷۔ تاریخ القرآن ۔ مصنفہ ابوعبداللہ الزنجانی، مطبوعہ بیروت ۔ سنہ ۱۳۸۸ھ
۸۔ التبیان فی تفسیر القرآن ۔ مصنفہ الطوسی، ابوجعفر محمد بن الحسن مطبوعہ عراق سنہ ۱۳۷۶ھ
۹۔ التبیان فی علوم القرآن ۔ مصنفہ محمد بن علی الصابونی، مطبوعہ بیروت سنہ ۱۳۹۰ھ
۱۰۔ تفسیر جلالین ۔ مصنفہ جلال الدین السیوطی وجلال الدین المحلی، مطبوع قیومی کانپور۔
۱۱۔ تفسیر القرآن الکریم ۔ مصنفہ ابن کثیر، عماد الدین، ابوالفداء اسماعیل بن کثیر، دار احیاء الکتب العربیۃ مصر

۱۲- جامع الترمذی - مصنفہ ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ الترمذی - مطبوعہ ہند -

۱۳- الجامع الصحیح - مصنفہ محمد بن اسماعیل البخاری۔ مطبوعہ میرٹھ ۱۳۲۹ھ

۱۴- حجۃ اللہ البالغۃ - مصنفہ شاہ ولی اللہ الدہلوی، مطبوعہ مصر ۱۳۵۲ھ

۱۵- سُنن ابی داؤد - مصنفہ ابوداؤد سلیمان بن الاشعث السجستانی، مطبوعہ ہند ۱۳۷۵ھ

۱۶- شرح فقہ اکبر - مصنفہ ملّا علی قاری، مطبع آفتاب، ہند، ۱۲۷۷ھ

۱۷- صحیح مسلم - مصنفہ مسلم الحجاج القشیری، مطبوعہ نولکشور، لکھنؤ، ۱۳۱۹ء

۱۸- عمدۃ القاری - مصنفہ بدر الدین، ابو محمد محمود بن احمد، العینی، الحنفی، مطبوعہ مصر ۱۳۰۸ھ

۱۹- فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت - مصنفہ بحر العلوم ملا ولی اللہ، مطبوعہ مصر ۱۳۲۴ھ

۲۰- مباحث فی علوم القرآن - مصنفہ ڈاکٹر صبحی الصالح۔ مطبوعہ بیروت، ۱۹۶۸ء

۲۱- مباحث فی علوم القرآن - مصنفہ مناع القطان۔ مطبوعہ الدار السعودیۃ -

۲۲- مجمع البیان فی تفسیر القرآن - مصنفہ شیخ ابو الفضل بن الحسن الطبرسی، مطبوعہ تہران ۱۹۷۳ء

۲۳- مجلّۃ لواء الاسلام - مقالۃ عبد الوہاب حمودۃ - مطبوعہ مصر ۱۹۴۷ء

۲۴- تذکرۃ علوم القرآن - مصنفہ احمد احمد علی، مطبعۃ الأزہر قاہرہ - ۱۳۶۸ھ -
۲۵- تذکرات فی علوم القرآن - مصنفہ محمد علی سلامۃ، مطبوعہ مصر، ۱۹۴۸ء -
۲۶- مسند احمد بن حنبل - مصنفہ الامام ابوعبداللہ احمد بن حنبل الشیبانی، مطبع میمنیّۃ، مصر - ۱۳۰۶ھ
۲۷- المصباح المنیر - مصنفہ احمد بن محمد بن علی المقری، الفیومی - المطبعۃ الکبریٰ الأمیریۃ - مصر ۱۳۲۴ھ
۲۸- المفردات فی غریب القرآن - مصنفہ راغب الاصفہانی - مطبوعہ مصر -
۲۹- مقدمۂ ابن خلدون - مصنفہ ابن خلدون المغربی - المطبعۃ البہیۃ - مصر -
۳۰- مناہل العرفان فی علوم القرآن - مصنفہ محمد عبد العظیم الزرقانی - دار احیاء الکتب العربیۃ مصر، ۱۳۷۲ھ
۳۱- الموافقات فی اصول الشریعۃ - مصنفہ ابراہیم بن موسیٰ الشاطبی - مطبعۃ المکتبۃ التجاریۃ - مصر -

اردو کتب

۱- اسوۂ صحابہ - مصنفہ مولانا عبدالسلام ندوی - مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۳۵۱ھ
۲- تاریخ القرآن - مصنفہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری - مطبوعہ علی گڑھ - ۱۳۴۱ھ -

۳۔ تاریخ القرآن ۔ مصنفہ مولانا مفتی عبداللطیف رحمانی مطبوعہ مونگیر (بہار) سنہ ۱۳۴۳ھ ۔

۴۔ تاریخ القرآن ۔ مصنفہ مولانا قاضی عبدالصمد صارم ۔ مطبوعہ دہلی، سنہ ۱۳۵۹ھ ۔

۵۔ ترجمان السُّنّۃ ۔ مؤلّفہ مولانا محمد بدر عالم میرٹھی ۔ مطبوعہ دھلی سنہ ۱۳۶۷ھ ۔

۶۔ ترجمان القرآن ۔ مصنفہ مولانا ابوالکلام آزاد مطبوعہ ہند، سنہ ۱۹۳۱ء ۔

۷۔ تفسیر بیان القرآن ۔ مصنفہ مولانا اشرف علی تھانوی ۔ مطبع مجتبائی دہلی سنہ ۱۹۲۶ء ۔

۸۔ رسالہ الفرقان (شاہ ولی اللہ نمبر) مرتّب مولانا منظور احمد نعمانی ۔ محبوب المطابع دہلی، سنہ ۱۹۴۱ء

۹۔ سیرۃ النبی (جلد چہارم) مصنفہ سید سلیمان ندوی، مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڑھ سنہ ۱۳۵۳ھ ۔

۱۰۔ علم الکلام ۔ مصنفہ مولانا محمد ادریس کاندھلوی ۔ مطبوعہ مطبع صدیقیہ، ملتان، پاکستان ۔

۱۱۔ علوم القرآن ۔ مصنفہ مولانا محمد تقی عثمانی ۔ مطبوعہ مشہور پریس کراچی، سنہ ۱۳۹۶ھ ۔

۱۲۔ الفوز الکبیر ۔ مصنفہ شاہ ولی اللہ الدھلوی (اردو ترجمہ از مولانا رشید احمد انصاری) مکتبہ برھان دہلی سنہ ۱۳۷۴ھ ۔

۱۳۔ مقالات شبلی (حصہ اول مذہبی) ۔ مصنفہ مولانا شبلی نعمانی ۔ مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڑھ سنہ ۱۹۵۴ء ۔

۱۴۔ مقدمہ تفسیر نظام القرآن۔ ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی۔
مطبوعہ اعظم گڑھ۔

۱۵۔ وحی الہٰی۔ مصنف پروفیسر سعید احمد اکبر آبادی، مطبوعہ
ندوۃ المصنفین دہلی ۱۳۶۰ھ۔

انگریزی کتب

1 The Arabian prophet
DR Ata Mohyuddin
Firoz printing works
Lahore 1955

2 The Spirit of Islam
Ameer Ali Syed London 1952

3 On Heroes and Hero-worship
Thomas Carlyle
Oxford University Press
London 1950

4 Introduction to Islam
DR Mohd Hamidullah
Publication Centre of
Islamic Studies
Paris 1950

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

کی چند اہم شاہکار تصنیفات

تاریخ دعوت و عزیمت مکمل (چھ حصے)
مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش
انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر
منصب نبوت اور اُس کے عالی مقام حاملین
دریائے کابل سے دریائے یرموک تک
تذکرہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ
تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات و احسانات
تبلیغ و دعوت کا معجزانہ اسلوب
مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں
نئی دنیا (امریکہ) میں صاف صاف باتیں
جب ایمان کی بہار آئی
مولانا محمد الیاسؒ اور اُن کی دینی دعوت
حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب
عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح
تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک
مطالعہ قرآن کے مبادی اصول
سوانح شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ
خواتین اور دین کی خدمت
کاروانِ ایمان و عزیمت
سوانح مولانا عبد القادر رائے پوریؒ

نبی رحمتؐ مکمل
حدیث کا بنیادی کردار
معرکۂ ایمان و مادیت
پرانے چراغ مکمل (دو حصے)
ارکانِ اربعہ
نقوشِ اقبال
کاروانِ مدینہ
قادیانیت
تعمیرِ انسانیت
حدیثِ پاکستان
اصلاحیات
صحبتے با اہلِ دل
کاروانِ زندگی مکمل
مذہب و تمدن
دستورِ حیات
حیاتِ عبد الحئیؒ
دو متضاد تصویریں
تحفۂ پاکستان
پا جا سراغ زندگی
عالم عربی کا المیہ

ناشر ــ فضل ربی ندوی ــــ فون ــ ۶۱۱۸۱۷

مجلس نشریاتِ اسلام، ناظم آباد مینشن ۱۔ کے ۳۔ ناظم آباد ۱ کراچی ۱۸

شاہ نور پیرو سس فون: ۹۲